

# سی ایف ایم کے راحت

فریبہ دینے والوں کے لئے ایک پُر فریب داستانہ  
اسی مناظر انسان کی کہانی جیسا کہ دعویٰ تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا مجرم ہے  
مجرم کے انوکھے انداز، ڈرامائے واقعات کے حشر سا مانیات

شہد پیدا ہوئی تھی پر وارن سے کہہ میں ڈوبا ہوا تھا۔  
لیکن ڈوبی ڈوبی ہوتی ہے اور ڈوبتی کے دوران موسم کی شدت کو  
نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایرپورٹ کا حملہ بھی مستعد تھا۔ جہاز  
رن سے ہرگز چکا تھا اور اس کے مسافروں کو آرام سے اتارنا۔  
ملکی ذمہ داری۔ چنانچہ اس برٹ آئرس لائن میں جبکہ عام  
رنگ لٹائوں سے منہ نکالنا بھی پسند نہیں کرتے۔ ایرپورٹ کا کام  
اپنی ذمہ داریوں میں صرف تھا۔

ٹی بی لگ گئی تو مسافر بچتے آتے لگے۔ سب سے سب مری  
ہے پوچھ رہے تھے۔ انہیں گلاریوں میں جھانک کر پورٹ کی عمارت میں  
لا گیا۔ اور ٹم کا نام اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے میں صرف ہو گیا۔  
سامان کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اور مسافر اپنے اپنے سامان  
کی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کسٹم انسر اُن کے سرٹ کیس اور دوسری  
چیزیں دیکھ کر نشانات لگاتے جا رہے تھے۔

پھر ایک کسٹم آفیسر نے ایک خراب صورت اور زلفی ٹوٹ  
کیس کو اپنے سامنے سرکایا اور سوالیہ انداز میں مسافروں کی طرف  
دیکھنے لگا۔ اس سوٹ کیس کا مالک نوجوان آگے بڑھا آیا۔ یہ ایک  
دراز قامت نوجوان تھا۔ عمدہ لباس میں ملبوس۔ سٹ گفٹ چہرہ  
خند زغال سے اس کی قومیت کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل ہی  
تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”جاہلی“ کسٹم انسر نے سر ہچکے میں کہا۔ اور نوجوان نے چانی  
اس کی طرف بڑھا دی۔ اور پھر جوڑی سوٹ کیس نکلا کسٹم آفیسر  
کی آنکھیں نمونے پھیلا گئیں۔ سوٹ کیس میں سب سے پہلی چیز جو  
آفیسر کو نظر آئی تھی وہ جدید ساخت کی ایک اسٹین گن تھی۔

”یہ۔ یہ سوٹ کیس آپ کا ہے؟“ اس نے چونکا ہوا کر نوجوان  
کو گھورا۔

”جی ہاں۔ اس کو چانی میں نے ہی آپ کو دی ہے۔“  
”یہ کیا ہے؟“ کسٹم آفیسر کا لہجہ سخت ہو گیا۔  
”اسٹین گن، نوجوان سکون سے بولا۔

”خوب“ اور کیا ہے اس میں کسٹم آفیسر نے حفاظتی مزہ  
کے لگوں کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور وہ لوگ نزدیک ہو گئے۔  
”جنگلے آسٹی کم ہیں۔ دوپ تھل میں اور سچ کپڑے، نوجوان  
معصومیت سے بولا۔ اور کسٹم آفیسر جلدی جلدی چیزیں لٹنے لگا۔  
نوجوان کا بیان درست تھا۔ وہ چیزیں موثر تھیں۔ جن کو اس نے  
نشانہ ہی کی تھی۔

”آپ جہاز سے غیر قانونی اسلحہ لاتے ہیں۔ اور بھی سامان

تہ آپ کا؟  
”جی ہاں۔ یہ دو سو سو کسٹم کیس بھی میرا ہے۔ تو تو ان نے کہا  
اور آفیسر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دو سو سو کسٹم  
بھی کھول ڈالا۔ ایک اور سنسنی نیز لہجہ۔ دو سو سو کسٹم کیس مقامی امہ  
نیز مالکی کسٹم سے بھرا ہوا تھا۔

”یہ..... یہ..... آفیسر کی سانس پھیلنے لگی۔  
”کسٹم ہے؟ کیا یہاں میں بھی کامروں گا۔ حاصل آپ  
میکر نام سے واقف نہیں ہیں جناب۔ میرا خیال ہے پہلے  
میزان تارت ہو جائے۔ مجھے ضرور پتہ چلتے ہیں۔ آپ کی زبان میں سفر  
ایک بے حقیقت نقطہ یاد آ رہا۔ لیکن اگر غور کریں تو یہ دائرہ  
کتنی ہی ہی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک کسٹم۔ دس کے سو۔  
سو کے ہزار ہزار کے لاکھ۔ کیا خیال ہے۔ کیا میں بے حقیقت  
ہوں۔“

”تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟“  
”یہی جیب میں۔ تو تو ان نے جواب دیا۔  
”کیا اسے چیک کر لیا گیا؟“  
”تمہیں اپنے غلطے پر اعتماد نہیں ہے؟ اس نے سوال کیا۔  
”پاسپورٹ پر تمہارا نام کیا درج ہے؟“  
”ایڈورڈ ہتھمب۔ لیکن یہ صرف پاسپورٹ پر درج شدہ  
نام ہے۔ میری اصلیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔“  
”تو گویا تم نے پاسپورٹ میں اپنا نام غلط درج کرایا ہے؟“  
”جی ہاں۔“

”اس لئے کہ میں ایک جرائم پیشہ شخص ہوں۔ اور اس ملک  
میں میں جرائم کے ارادے سے آیا ہوں۔ میرا طریقہ کار ایسا ہی ہے۔  
پہلے میں یہاں قدم جماؤں گا۔ ایک عمدہ حیثیت اختیار کروں گا  
اور اس کے بعد۔ اس کے بعد تم دیکھ لینا۔ نوجوان نے مسکرا کر لکھ  
مارتے ہوئے کہا۔  
”تب میرا خیال ہے کہ میں تمہیں اس کا موقع نہ دوں۔ اور  
یہاں جرائم شروع کرنے سے قبل ہی.....“  
”ہاں یہ تمہارا فرض ہے آفیسر۔ اور انسران کو فرض شناس  
ہونا ہی چاہئے۔ بس اب یہ سامان بنا کر دو۔“  
آفیسر نے اس کے سوٹ کیس بند کر دیئے۔ وہ غصے سے  
حفاظتی غصے کے لوگ پوری طرح مستعد تھے اور اس کے ایک  
اشارے پر نوجوان پر قابو پا سکتے تھے۔

”کیا یہ کبھی تمہارا ہے؟“ اس نے تیسرے بس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔  
”ہاں! لیکن براہ کرم اسے بند ہی رہنے دیں۔“

”کیوں؟“  
”تم مجھے گرتا کرنا چاہتے ہو نا؟“  
”اے! آئیے کرنا اس شخص کی دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا اور نہ سوج رہا تھا کہ جہاں میں رہنے والے توش نصیب لوگ اس دور نہ آتے تھے جہاں میں بھی کوئی ہنگامہ برپا کر دیتا تو جہاز کی سلامتی ناممکن تھی۔“

”اگر تم مجھے گرفتار کرنے کے خواہشمند ہو آئیے تو اس بس کو دست کھولو۔“

”میں اسے کھولنے کے بعد بھی تمہیں گرفتار کر لوں گا، یہ فکر نہ ہو۔ آئیے اسے اس بس کا بھی ٹانگہ کھول لیا۔ لیکن جہاز اس نے کبھی ہلکا سا ہلکا کرنا، ایک ہلکا سا دھکا ہوا۔ اور دھوکا کا ایک عظیم الشان بادل بلند ہو گیا۔“

آئیے نے ہلکا ہونے سے نہ انداز میں پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بدن نے کام چھوڑ دیا۔ وہ زمین کا ہم اتنی تیز رفتاری سے بڑھا تھا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

کشم آؤں میں جتنے لوگ تھے سب کے سب ہلکا ہونے سے انداز میں ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان کے اعضا ان کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ نہ آواز نکال سکتے تھے نہ ہی چل سکتے تھے۔

بس ایک سکنے کی ہی کیفیت طاری تھی جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو۔ اور ساری تصویریں ساکت ہوں۔

”تصور تمہارا ہے آئیے میں نے پہلے ہی کہا تھا۔“ نوجوان کی آواز ان کے کانوں میں اٹھی۔ صرف وہ تھا جو اس طلسم خانہ میں حرکت کر سکتا تھا۔ نہ جانے اس پر کیوں یہ بے رنگت و صواں اثر انداز نہیں ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں سرٹیکس بھیک کئے اور انہیں ہاتھوں میں لٹکالیا۔

”اچھا دوستو خدا حافظ۔ اور مال آئیے لو لیس کو میرے بارے میں تفصیلی اطلاع ضرور دینا۔ وہ دونوں سوٹ گیس ہاتھوں میں لٹکائے باہر نکل آیا۔ شدید ہمدردی کے باعث ان دونوں ہمدردی مند لوگ ہی تھے کسٹم سے اس سے قبل بھی چند لوگ فارغ ہو کر باہر نکل آئے تھے اس لئے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور وہ اطمینان سے ایئر پیٹ سے باہر نکل آیا۔ ایک کسی اسکے قریب پہنچ گئی تھی۔“

ہوٹل میٹرو سائن کے ریکیشن ہال میں ملکی ملکی موسیقی گونج رہی تھی۔ نوجوان جڑے چھٹی فریش پرسوسٹی کی لے کے ساتھ ساتھ ہلکا ہلکا رہتے تھے۔ ٹھنڈی ریٹی میں ہاتھوں خاصا شکر اور اور سائی محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں آنے والے زیادہ تر سنجیدہ اور اعلیٰ طبقے کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ اس لئے کسی بیرونی کانوں آقا تو بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب قریب کی ایک میز سے ایک تنہا نوجوان اٹھ کر قفس کو لے کر لوگوں میں شامل ہو گیا تو دونوں پرسکرامیں بھر گئیں۔ نوجوان شاید نیشنل برہم سلوم ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور دونوں ہاتھ اس پر زین میں لے آیا تھا جیسے اس کے ساتھ اس کی ہم نشین ہو جو دوران ایسی شکل بنانے ہوئے وہ چھٹی فریش ہر دوسرے ہونڈوں کے درمیان، قفس کو رہا تھا۔ لوگ اس کے لئے راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ تقریباً جس نے ہی اسے دیکھا اس کے ہونڈوں پر سکرامٹ بھیل گئی۔ لیکن بات اسی حد تک نہ رہی۔ ایک بار جب ایک قفس کرتا ہوا بڑا اتفاقیہ طور پر اس سے ٹکرایا تو اس نے ہدایت چاہا کہ تھی سے اس شخص کی ہم قفس کو اپنی طرف کھینچ لیا اس وقت وہ زمان اس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔ البتہ لڑکی کو قفس کی پر زین پر لڑکی قفس شروع کر دیا۔ لڑکی ایک دم ٹھٹھا گئی۔ اس نے اپنے آپ کو لڑکے کی گرفت سے پھرانے کی کوشش کی لیکن گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ناکام رہی۔ اس کا ہم قفس تیز انداز میں حلق پھاڑا کھڑا تھا۔ یہ درمیانی عمر کا ایک شریف صورت شخص تھا جس کی کپڑوں کے ہال سفید تھے اور جس کی بسامت نماسی تھی۔ چند ساعت تو وہ اسی طرح اس لڑکے کو دیکھتا رہا اور اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس کی ہم قفس نوجوان کی گرفت میں کھسار رہی ہے اور شاید نکل جا رہی ہے اور شاید اس میں ناکام ہے اور پھر جب اسے ہرورت حال میں اس ہوا تو اس کے جسم میں خون کی روانی تیز ہو گئی۔ وہ نتیجہ انداز میں آگے بڑھا اور اس نے اپنا چوڑا ہاتھ نوجوان کے شانہ پر رکھا اور اسے اپنے کی کوشش کی لیکن نوجوان ایک لمبی لہر لے کر اس کی آواز سے نکل گیا تھا۔ لڑکی بڑھو اس کی باہوں میں تھی حالانکہ وہ قفس نہیں کر رہی تھی لیکن نوجوان اسے قفس ہی کے انداز میں گھسیٹ رہا تھا۔ اس بار شاید لڑکی کے ہم قفس کے مہر کا بیانیہ لہر نہ ہو گیا چنانچہ وہ نوجوان کے نزدیک پہنچا اور اس کے بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ نوجوان نے تیز انداز میں آنکھیں کھول دیں تب تو اسے اور پھر وہ اسقول کی طرح آنکھیں بھیچا پکا لگا۔ قوی سیکل شخص نے لڑکی کو اس کی گرفت سے آزاد کر لیا اور نوجوان لہجے میں بولا۔ ”یہ کیا بزمینی ہے؟“

”بزمینی نہیں قفس ہے توہر، نوجوان نے گھٹن ہلاتے ہوئے کہا اور اس نے ایک ہار پھر لڑکی کو اپنی گرفت میں لینے کی

کوشش کی لیکن قوی سیکل شخص کو گھونسا اس کی طرف بڑھا۔ نوجوان نے انتہائی چھٹی سے ایک دوسرے ہونڈوں کے مرد کو لگے کر دیا اور اس قوی سیکل شخص کا گھونسا اس دوسرے شخص کی ٹھوڑی پر پڑا۔ گھونسا خاصا زور دار تھا اور شخص اچھل کر نیچے جا پڑا۔ نوجوان اطمینان سے الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس شخص پر بڑھلا ہٹ کے دوسرے ہونڈوں تھے۔ وہ نوجوان کو کھول کر مندرت آمیز انداز میں اس شخص کی طرف بڑھا اور اس کے گھولے سے پھر گڑھا تھا اور پھر اس نے گھرے ہوئے شخص کو اٹھانے کی کوشش کی۔

”معاف کیجئے۔ معاف کیجئے گا جناب۔ اس بزمینی شخص کی وجہ سے۔ اس نے کہنا چاہا لیکن نیچے گرے ہوئے شخص کو یہ بات شاید سنائی نہیں دی چنانچہ اس نے دوسرے لمحے ایک بھر پور لڑائی قوی سیکل شخص کے پیٹ پر ماری۔ قوی سیکل شخص کسی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ دوسرے لمحے گرا ہوا نوجوان اٹھ گیا اور اس نے دیشانہ انداز میں قوی سیکل شخص پر حملہ کر دیا لیکن قوی سیکل شخص واقعی طاقتور تھا۔ اس نے دوسرے نوجوان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور بدستور اس سے مندرت آمیز لہجے میں بولا۔

”کیسے آپ میری بات تو سن لیجئے۔ وہ دراصل۔ لیکن دوسرے نوجوان نے اسے حملہ ہرا کرنے نہیں دیا تھا اور بڑے ہی طرح اسکی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ قفس کرنے والے یہ رک گئے اور منتظلم اس جانب دڑے لیکن جڑے گامہ کرانے والا تھا وہ ان لوگوں سے کافی فاصلے پر چلا گیا۔ وہ نوجوان اب بھی اسی انداز میں قفس کر رہا تھا جیسے اس کی ہم قفس اس کے ساتھ ہو۔ لوگ ایک دوسرے سے باز پرس کرنے لگے اور اصل صورت حال پتہ ہی نہ چل سکی۔

بمشکل تمام اس نوجوان کو قابو کر لیا جو گھولنے کا شکار ہو گیا تھا۔ قوی سیکل شخص کو اب بھی اس پر غصہ نہیں آیا تھا۔ اور وہ معتد آمیز انداز میں اس سے یہی کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ غلطی ہی کی بنا پر ہوا۔ دراصل اس کا ستھنی دوسرا شخص تھا اور جب اس شخص کی تلاش میں اس نے لگائیں دوڑائیں تو اس کا پارہ چھو گیا۔ وہ تیزی سے نوجوان کی جانب بڑھا اور جب اس نے نوجوان کے کوٹ کے کالر پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو نوجوان بھر بھر کا کی دے کر آگے بڑھا آیا۔ لیکن اب بھی اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ قفس کی ایک لہر لیکر اس طرف نکل آیا ہو اور پھر تو ایک عجیبے غریب ہنگامہ برپا ہو گیا۔ قوی سیکل شخص بھی شاید اپنی شخصیت بھول کر طبیعت سے دلوانہ ہو گیا تھا۔ وہ اس نوجوان کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کوشش میں مختلف لوگوں سے ٹکرا رہا تھا اور نوجوان تھا کہ جھلاوے کی طرح اس کو ادھر ادھر بھرا ہوا تھا اور خاص بات یہ تھی کہ انداز قفس ہی کا تھا اب تو

یہ شمار قہقہہ اٹھانے لگے تھے۔ نوجوان کی اس حرکت پر بہت سے لوگ نہیں رہے تھے۔ دیشی قوی سیکل شخص نے کسی شخص نے الجھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اب صورت حال شخص کی سمجھ میں آگئی تھی تب منتظلم کر ہی طعنے آیا اور بہت سے لوگ اس نوجوان کی طرف دوڑ پڑے۔ چند لمحوں میں وہ پکڑ لیا گیا اور ہونڈوں کے منہ جرنے سے بچو پڑتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“  
نوجوان نے پھلوس انداز میں آنکھیں کھولیں جیسے اب تک سب کچھ سوتے میں کر رہا ہو۔ اس نے تہجبانہ انداز میں سب کی شکلیں دیکھیں اور پھر کراہتے ہوئے بولا۔ ”میں کہاں ہوں؟“  
”کیا لگتا ہے۔ یہ کیا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے تم نے؟“  
”مہنگا ہمارے۔ میں نے۔“ نوجوان نے گھولے گھولے انداز میں کہا۔ اس کے چہرے پر بڑی معہ و میت نظر آ رہی تھی۔ یوں بھی وہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں خواب آلودی کیفیت تھی اور چہرہ تو ایسا الگ الگ رہا تھا جیسے اس نے کبھی اس دنیا کی شکل ہی نہ دیکھی ہو۔

”کیا تم پاگل ہو؟“  
”تعلقاً نہیں۔“ نوجوان نے انتہائی معصومیت سے کہا۔  
”یہ سب کچھ کیا شروع کر رکھا ہے تم نے؟“  
”میں۔۔۔ میں نے تو۔۔۔ اوہ! یہ لکرو۔۔۔ یہ لکرو کہہ رہی ہے۔“  
نوجوان کھولے کھولے انداز میں بولا۔

”شاید زیادہ پی گامہ جناب۔“ انتظامیہ کے ایک شخص نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔  
”یہاں ہی لگتا ہے لیکن کیا یہ ہمارے ہونڈوں میں مقیم ہے؟“  
”میں نے سوال کیا۔ اور ایک سپروائزر آگے بڑھ کر بولا۔  
”جی ہاں جناب۔ رزم ہنڈوں کا مسافر ہے۔ مظاہر شریف آدمی ہے، لیکن میرا خیال ہے ضرورت سے زیادہ پی گیا ہے۔“  
”اوہ! اسے اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ ورنہ ہنگامہ ہو جائے گا۔“ منیجر نے کہا۔ اور دو آدمی اس نوجوان کو بازوؤں سے پکڑ کر اس کے کمرے کی طرف لے جانے لگے۔ نوجوان نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب اس کے چہرے پر عجیبے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ سخت غمزوہ ہو رہا تھا۔ اسے ریکریشن ہال سے نکال کر لفٹ تک لایا گیا تو اس نے بھرتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ لوگ تکلیف نہ کریں میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“  
”پھر کوئی ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کرو گے۔ ان میں سے ایک شخص بولا۔“

انہیں دوستو ایسی بات نہیں ہے۔ میں بڑا بے صیبا انسان ہوں تو جو ان نے بھرتائی ہوئی آواز میں کہا۔  
 کیا مطلب؟ ان میں سے ایک شخص نے پوچھا لیکن وہ لوگ اسے لفٹ میں لے ہی گئے تھے اور لفٹ اوپری منزل کی طرف جا رہی تھی۔

دراصل میں ذہنی مریض ہوں۔ کبھی کسی میرے اوپر ایسے ہی دروسے پڑھاتے ہیں حالانکہ ان کا وقت مخصوص ہوتا ہے لیکن اسی مختصر وقت میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ کسی تنہا جگہ میں رہوں۔ کسی ایسی جگہ نہ جاؤں جہاں ہنگامے کا خطرہ ہو۔ مگر قیمتی صرف میری بد قسمتی۔ نوجوان کے انداز میں اتنی اداسی اور مصوہیت سمجھی کہ وہ ہڈوں میں مٹا کر ہوئے بغیر نہ سکے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی شکایتیں اور پھر شانے ہلا کر رہ گئے۔ لفٹ دوسری منزل پر رک گئی اور وہ نوجوان گریلی میں لے کر آگئے۔

اب تمہاری حالت کیسی ہے؟  
 ٹھیک ہوں ذرا دھیرے سے اور انہیں لہجے میں کہا اور لوگ بڑھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ پھر جب وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تب وہ دونوں واپس پلٹے تھے۔  
 کیا وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا؟ ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔

مخلا جانے آج کل کے نوجوان بنانے کا کیا شراب میں کرتے رہتے ہیں۔ ویسے اس نے ماحول کو کافی خواب کر دیا تھا۔ دوسرے نے جواب دیا اور دونوں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئے۔ نیچے کا ہنگامہ اب ختم ہو گیا تھا لیکن ریشٹن ہال پر جوڑے نہیں تھے۔ ویسٹی آہستہ آہستہ اپنے رنگ بکھیر رہی تھی۔ ریٹرنے شراب کی دوسری بوتل اس کی مینو پر رکھ دی۔ نوجوان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر عجیب سی غم آلود کیفیت بکھری ہوئی تھی نفاست سے شراب کی دوسری بوتل مینو پر رکھنے کے بعد ریٹرنے ادب سے گزرنے لگا کر کہا۔

بکسی ان چیز کی ضرورت تو نہیں ہے جناب؟  
 وہ ریٹرنے نوجوان بھرتائی ہوئی آواز میں بولا  
 "یس سز"  
 کیا تم میرے لئے تھوڑا سا زہر مینا کر سکتے ہو؟ نوجوان اسی انداز میں بولا۔

جی! ریٹرنے نے تھوڑا سا انڈاز میں لکھیں سمجھیں۔  
 میں مرنا چاہتا ہوں۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔

اگر تم نے مجھے اس شراب میں زہر ڈال کر نہیں دیا تو میں اس کھڑکی سے کود کر خودکشی کر لوں گا۔ نوجوان نے ایک ایسی کھڑکی کی جانب رخ کر کے کہا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور جن سے باہر نکل جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ریٹرنے کے ہنر میں پر مسکلاہٹ پھیل گئی۔ ایسے لوگوں سے اکثر اس کا واسطہ پڑتا رہتا تھا جو شراب پینے کے بعد بڑی عجیب و غریب حرکتیں کرتے تھے اور پھر شیخوں کو فطرتاً ہی عجیب۔ جس دن سے ہنر میں آیا تھا کوئی نہ کوئی ہنگامہ ہر بار کرتا رہتا تھا۔ پہلی رات اس نے ریشٹن ہال میں خاصا ہنگامہ مچایا تھا اور جس اس سے ناخوش تھا۔ نیچر نے اس کے کمرے میں آکر درخواست بھی کی تھی کہ اگر وہ خود پر قابو نہیں پاسکتا تو کم از کم اپنے کمرے تک ہی مقیم رہے یا اس ہنر میں سے کہیں اور مقیم ہو جائے تاکہ ہنر کی رہنمائی نہ ہو۔ نوجوان نے یہ انتہائی خرمندی کا اظہار کرتے ہوئے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک مرض کا شکار ہے۔ یہ باتیں ہنر کے محلے کے دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہو گئیں تھیں۔ بہر صورت ہنر میں تو ہر قسم کے لوگ آجاری کرتے تھے پھر کسی نے ان باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی لیکن وہ اس کی اس وقت کی بات سے خاصا محظوظ ہوا تھا۔  
 لیکن جناب آپ خودکشی کرنا ہی کیوں چاہتے ہیں۔ اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

میں بہت غم زدہ انسان ہوں، میرے دوست نوجوان غمگین لہجے میں بولا۔ جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو میری بی بی گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے بیویوں کی بے دفاعی سے دل شکستہ ہو کر بند پالنے شروع کر دیے۔ لیکن بندر بس وہ بھی بھاگ جاتے ہیں۔ یہاں کوئی بھی کا نہیں ہے۔ وہ اس لئے میں خودکشی کر لینا چاہتا ہوں۔

"اور مجھے آپ سے ہمدردی ہے جناب"  
 "ہمدردی ہے تو میرے لئے زہر مینا کرو۔"  
 بہتر ہے میں کوشش کروں گا۔ ریٹرنے نے جان پھرنے کی ٹھن سے کہا۔ اسے علم تھا کہ نوجوان کے سامنے رکھی ہوئی شراب کی ساڈی بوتل خالی ہو چکی ہے اور اب اس نے دوسری بوتل بھی طلب کی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ دوسری بوتل خالی ہونے کے بعد وہ کھڑکی کی سلاخوں سے نکلنے کی کوشش کرے۔ بہر حال وہ واپس پلٹا تو دوسرے لمحے نوجوان کی کزخت آواز سے سنا لی اور وہ ریٹرنے پھر رک گیا۔

"اور دھراؤ؟ نوجوان نے کہا اور وہ ریٹرنے کے قریب پہنچ گیا۔ نوجوان نے قریب رکھا اور انہماک کے سامنے ڈال دیا۔

کیا تم اسے پڑھ سکتے ہو؟ نوجوان نے دستور کزخت لہجے میں کہا اور ریٹرنے کی نگاہیں اخبار پر ڈرنے لگیں۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ نوجوان کے اشارے پر اس نے اس خبر پڑھیں دوڑائیں جس خبر کو وہ پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہ کسٹم آؤس سے نزار ہونے والے ایک ایسے شخص کی آفیسیل تھی جو یقینی طور پر جرائم پیشہ تھا اور جواز پر اسٹ پر دھاک کر کے کسٹم آؤس سے اپنا سامان لے چکا تھا۔ اس سامان میں بہت سی خطرناک چیزیں تھیں جن میں کئی بھی تھی۔

"یہی تم نے یہ خبر؟"  
 "جی ہاں جناب" وہ ریٹرنے جواب دیا۔  
 کیا خیال ہے اس شخص کے بارے میں؟  
 تو کوئی چالاک مجرم۔ وہ ریٹرنے جواب دیا

"خوب خوب۔ کیا تمہارے خیال میں یہ شخص قابلِ دائی ہے جس نے اتنے اطمینان کے کسٹم آفیسرز کو دھوکہ دیا اور وہ چیزیں لے کر نکل بھاگا جو قابلِ اعتراض تھیں؟

"جی ہاں جناب خاصا خطرناک مجرم مسلم ہوتا ہے۔ ڈیڑھ نے جواب دیا اور نوجوان نے مجرم کرائی جیسے ایک جواز نکال کر ریٹرنے کے حوالے کر دیا۔

"یہ رکھو تم مجھے خاصے بھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم جانتے ہو یہ نوجوان کون تھا؟"  
 "نہیں جناب میں نہیں جانتا"  
 خود جانو اور اسے دیکھ لو"

"جی کیا مطلب؟" وہ ریٹرنے سے بولا  
 "تم یقین کرو میرے دوست وہ میں ہوں۔ اتنے سارے لوگوں کو چکھ دے کہ باسانی اس ملک میں آگیا اور جانتے ہو میں کس

ارادے سے یہاں داخل ہوا ہوں؟" وہ ریٹرنے کی آنکھوں میں تعجب کے آثار تھے۔ پہلے تو وہ یہی سوچتا کہ نوجوان نشے میں ہے اور یہ کواں نشے کی حالت میں کی جا سکتی ہے لیکن پھر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ ممکن ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو کہ اکثر لوگ نشے کی حالت میں سچ بول دیا کرتے ہیں۔

"تم نے جواب نہیں دیا وہ ریٹرنے نے تم سے کوئی سوال کیا تھا۔ نوجوان نے اپنے سامنے رکھے ہوئے گلاس میں شراب اٹھ لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب میں نہیں جانتا" وہ ریٹرنے جواب دیا۔  
 "میں دنیا کا سب سے بڑا مجرم ہوں۔ جراتم میرے وجود کے ذمے ذمے میں پڑ گیا ہوں۔ بیشتر ملک میں میں نے ایسے ایسے

ہنگامے بہہ پاتے ہیں کہ وہاں کی پولیس آج بھی مجھے یاد کر کے ذات پستی تو ہی ہے لیکن بوبال سے کسی کی کرکٹی میرا بال بھی بیکار سکا ہو۔ میں جراتم کے ایسے انفریکٹے ایجا کر تا ہوں کہ لوگ رنگ نہ جاتے ہیں۔ اب تم ہی دیکھو کہ کسٹم آؤس میں وہ کس کھیلے گئے۔ جن میں سے ایک میں کڑی بھری ہوئی تھی جبکہ دوسرے میں اسٹین گن اور دوسرے ہتھیار لیکن کسی سے کس سے وہ دھماکہ ہوا۔ جراتم کسوں کو وہاں سے نکالنے میں معاون ہو سکتا تھا اور اب میں یہاں رہ کر یہ ثابت کروں گا کہ میں سب سے بڑا مجرم ہوں اور میرے مقابلے پر کئی جرائم پیشہ شخص نہیں جک سکتا۔

"جی ہاں، جی ہاں جناب"  
 "تو ریٹرنے ایسی حالت میں تم خود ہی بتاؤ کہ کیا تم اپنے وطن کو ایک ایسے مجرم سے پاک کرنا نہیں پسند کر گئے؟"  
 "میں نہیں سمجھا جناب" وہ ریٹرنے گھبراتے ہوئے کہا۔  
 "مجھے زہر دے دو۔ دیکھو میں تمہیں ایک صحیح مشورہ دے رہا ہوں۔ مجھے شراب میں ملا کر زہر دے دو تاکہ میں مر جاؤں جس کے بعد وہ جرائم نہ ہوں جو میری زندگی کی وجہ سے ظہور پذیر ہونے والے ہیں۔"

"جی بہتر ہے میں ابھی زہر لے کر آتا ہوں" وہ ریٹرنے سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ ممکن ہے نوجوان نشے میں یہ کہو اس کو رہا ہو لیکن جراتم اس نے کی تھی وہ اتنی سنسنی خیز تھی کہ وہ ریٹرنے اپنے آپ کو نیچر کے کمرے تک جانے سے نہ روک سکا۔

نیچر سر جھپکنے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے نگاہ اٹھائی اور وہ ریٹرنے کو سامنے کھڑے ہوئے پایا تو چونک کر بولا۔  
 "کیا بات ہے؟"

"وہ جناب ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں۔" وہ ریٹرنے جواب دیا  
 "کیسی اطلاعات؟" نیچر نے پوچھا  
 "میں دو نمبر ۳۳ میں مردوں کو رہا ہوں"  
 "تو پھر؟"

"یہ وہی رقم ہے جناب۔ جہاں وہی نوجوان مقیم ہے جس نے ڈاننگ ہال میں ہنگامہ مچا کر دیا تھا۔"

"کوئی خاص بات ہے؟" نیچر نے پوچھا  
 "جی ہاں جناب وہ اس وقت نشے میں ہے اور نشے کے عالم میں اس نے ایک ایسی بات بتائی ہے جس کی وجہ سے میں آپ کے پاس آنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ریٹرنے کہا اور نیچر اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"کوئی خاص بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

جی ہاں جناب! "نوجوان کو اس کو رونا نہیں کسی قدر بھیجھلاتے ہوئے انداز میں بولا۔"

"ابھی کل کے اخبار میں ایک خبر تھی جی جناب اور خبر یہ تھی کہ ایئر پورٹ پر کسٹم آفس میں ایک شخص کسٹم آفس زکوٰۃ دھوکہ دے کر کرنسی اور اسلحہ لے بھاگا تھا؟"

"ہاں میں نے وہ خبر پڑھی تھی لیکن مینیجر نے کہا۔ "نوجوان نے نشتے کے عالم میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ یہی ہے اور وہ جرائم کرنے کے لئے ہمارے ملک میں آیا ہے۔ اس وقت وہ نشتے کی کیفیت میں ہے جناب اور اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں نے اسے زہر دیتا نہیں کیا تو وہ اس ملک میں تباہی پھارے گا!"

"کیا کو اس ہے تم ایک ایسے آدمی کی بات پر بھروسہ کر رہے ہو نشتے میں ہے؟"

"نہیں جناب بھروسے کی بات نہیں لیکن میں نے اپنے طور پر یہ مناسب سمجھا کہ اس بات کی اطلاع آپ کو دیدوں۔"

"دیکھنے کہا اور مینیجر کی سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا: اچھا ٹھیک ہے میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تہہ جناب ڈیڑھ بج رہا ہے اور سناٹا کر کے نکل آیا مینیجر اپنا دلایا کال کھرا ہوا تھا۔ چند ساعت تو اس نے سوچا کہ دیکھ بات پر کیا اعتبار کرنا۔ وہ ایک نشتے میں ڈوبے ہوئے شخص کے بارے میں یہ اطلاع دے رہا ہے لیکن پھر اس سے بھی نہ رہا گیا۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے نزدیک پولیس اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا اور فون اپنے کان سے لگا لیا۔"

"ہیلو، دوسری طرف سے آواز آئی۔"

"میں میٹرو اسٹیشن کا مینیجر ہوں جناب۔"

"ہاں میں ایک ایسے آدمی کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔"

"اعتراف کر رہا ہے کہ اس نے پورے رات ایئر پورٹ کسٹم آفس میں دھاوا کیا تھا اور وہ چیزیں لے کر نکل بھاگا تھا جو ناجائز تھیں یعنی کرنسی اور اسلحہ۔"

"اوہ وہ نوجوان کہاں ہے؟ انسپکٹر نے سوال کیا۔"

"ہمارے ہی ہوٹل میں کمر نمبر ۳۱ میں مقیم ہے۔"

"وہ نشتے کے عالم میں ہے جناب اور اس وقت بھی شراب پی رہا ہے۔"

"کیا وہ کوئی ایسا شرابی تو نہیں ہے جو فضول بلواس کرنے کا عادی ہو؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میں نہیں کہہ سکتا جناب لیکن وہ پرسوں ہی ہمارے ہاں آکر مقیم ہوا ہے اور کل رات اس نے ہوٹل کے ریکارڈنگ ہاؤس بھی ہنگامہ کیا تھا پھر اس نے ہمارے سپروائزر سے کہا کہ وہ وہی شخصیت کا مالک ہے یعنی اس پر دوسرے پڑتے ہیں۔ اس وقت اس نے اس ہنگامہ کی کافی معذرت بھی کی تھی اور اس وقت اس شخص نے ویڈیو سے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے۔"

"کیا آپ ہمارا وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں مینیجر؟ انسپکٹر نے تند لہجے میں کہا۔"

"نہیں جناب اگر آپ اس شخص کو گرفتار بھی کریں گے تو میں جانتا ہوں کہ اس کی گرفتاری پر ایک لاکھ روپے کا نقصان عام نہیں ہے جو میں اس سے فائدہ حاصل کروں۔ اس نے ایک ویڈیو کے سامنے اس بات کا اعتراف کیا اور میں نے ایک اچھے شہری ہونے کی حیثیت سے آپ کو اس بات کی اطلاع دے دی ہے۔ مینیجر نے بھی ناخوشگوار لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ پولیس کا رویہ اچھا ہوتا ہی کس شخص کے ساتھ ہے مینیجر نے ہونٹ سکڑ کر سوچا اور ان کے معاملات میں ٹانگ اڑانا حماقت نہیں تو اور کیا ہے اور پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا لیکن تقریباً بیس منٹ کے بعد ایک پولیس انسپکٹر تقریباً چارپاہوں کے ساتھ اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔"

"مینیجر جو کام میں مشغول ہو کر اس گفتگو کو سمجھ چکا تھا۔ انہیں دیکھ کر ایک دم چونک پڑا۔"

"سوری مینیجر۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ آپ نے ابھی کچھ دیر قبل مجھے فون کیا تھا نا؟ انسپکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔"

"میرا موڈ اس وقت زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ میرا تخیل ہے میں نے اس وقت آپ سے مناسب گفتگو نہیں کی تھی۔ بعد میں میں نے سوچا کہ آپ نے واقعی اپنا فرض ادا کیا ہے۔ میں بھی کیوں نہ اپنا فرض ادا کر لیوں۔ مجھے اس شخص کے کمرے تک لے جائیے۔ کیا وہ شخص اس وقت اپنے کمرے میں موجود ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ تب وقت میں نے آپ کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اس کے بعد میں اس پر غور نہیں کیا۔ مینیجر نے جواب دیا۔"

"تب براؤ کر آئیے۔" انسپکٹر نے کہا اور مینیجر اپنی میزکے ہمچے سے نکل آیا۔"

اس کے بعد وہ اوپر کی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ روز نمبر ۳۱ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پچھلے نوجوان کھول کر اندر داخل ہوا اور پھر اس کے پیچھے پولیس۔ نوجوان اب بھی شراب کی پھیلائی چکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے بڑی سرور ڈگاہوں سے ان کو تڑپا کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔"

"پولیس انسپکٹر اس نے نشہ آلود لہجے میں کہا۔"

"میں،" انسپکٹر نے بڑھا دیا، "میں آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ پولیس کا کام ہی سوالات کرنا ہے۔ کہہ دیا کہ اپنا چاہتے ہو۔"

"آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟"

"ہاں، نوجوان نے جواب دیا۔"

"کہاں سے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔"

"اس دروازے کے باہر سے، پچھلے میں باہر تھا اور اب آ گیا۔" نوجوان نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پولیس انسپکٹر کے ساتھیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔"

"خوب، لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے قبل تم کہاں رہتے تھے؟" انسپکٹر نے لہجے میں اب بھی اتنی ہی تھی۔"

"بہت سی جگہوں پر،" انسپکٹر نے آدمی ہون اور آدنی کا کوئی ایک ہی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ میں تمہیں اپنے کون کون سے ٹھکانے بتاؤں۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔"

"میں پوچھتا ہوں کہ تم اس سے تین کہاں رہتے تھے؟"

"انسپکٹر نے قرآنی موٹی آواز میں کہا۔"

"ایسے ہی ایک دروازے کے پیچھے،" اس نے جواب دیا اور پولیس انسپکٹر اپنے ساتھیوں کی طرف ہونٹ کھینچ کر دیکھنے لگا۔ پھوللا، اس کمرے کی تلاش کی لو۔ اور اس کے ساتھ ہی چاروں طرف پھیل گئے۔ انہوں نے نوجوان کے مختصر سامان کی ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دی۔ اس دوران نوجوان اطمینان سے بیٹھا شراب کی چکیاں لیتا رہا اور انسپکٹر خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا اور پھر اس نے غصیلے لہجے میں کہا: کھڑے ہو جاؤ۔"

"مجھے سہارا دو میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔" نوجوان نے جواب دیا اور انسپکٹر نے کال کر کے اسے کھڑا کر دیا۔

تسے چہلی ڈاہن کا ساتھ ہے جہاں میں وہاں پولیس بیٹھ رہی بات ہے کہ کبھی کبھی جب میرا موڈ خراب ہے تو پولیس سے کچھ کہتی ہوں تو اسے اور میں آگے آگے،" اس نے آنکھیں میچھکے مینیجر کی جانب دیکھا اور ہنسنے لگا۔ پولیس انسپکٹر نے اس کا کال کر ڈیوار سے دروازے کی طرف دھکیل دیا اور وہ کئی قدم دوڑتا ہوا گیا۔"

پولیس کے ساتھیوں نے اسے سنبھال لیا تھا وہ شاید وہ گر ہی پڑے اور پھر پولیس انسپکٹر اسے لے کر آگے آگیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اسے گھاری میں بٹھاؤ پھر اس نے مینیجر سے کہا۔"

"یہ ممکن ہے مینیجر کہ یہ شخص صرف نشتے میں بلواس کر رہا ہو بہر صورت اگر کوئی گڑبگڑ جوتی تو تمہیں یہی مدد کرنا ہوگی۔"

"میں حاضر ہوں جناب جو آپ چاہیں میں اس پر عمل کروں گا۔"

"بہت بہت شکریہ،" ممکن ہے کہ یہ کوئی غیر ملکی ہی ہو۔ ایسی حالت میں ہم زیادہ پریکٹس کا شکار ہو سکتے ہیں۔ بہر صورت اپنا شہرہ رنی کرنے کے لئے تم تحقیقات ضرور کریں گے۔"

"میرا جو کچھ تعاون آپ چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔ مینیجر نے انسپکٹر کو یقین دلایا اور انسپکٹر باہر نکل گیا۔"

تعمیری دیر بعد وہ شخص ایک۔ اپ میں تھا اور پھر مسرور تھا۔ اس دوران اس نے کئی باختلاف اشعار بھی سنائے تھے تو کبھی انگریزی میں ہوتے کبھی پنجابی میں اور کبھی عربی زبان میں۔"

انسپکٹر انگریزی زبان کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن بہر حال اس نے انسانی کیفیت سے اندازہ لگا لیا کہ یہ مختلف زبانیں سمجھ سکتی ہیں اور اس لئے یہ اندازہ ہو گیا کہ نوجوان کہاں سے آیا ہے اور اس شخصیت نہیں ہے۔ وہ پریشان بھی تھا اور اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ لسنے جیسے مجرم کو گرفتار بھی کرے جس نے یہ پورے کسٹم آفس میں ہنگامہ کیا تھا۔ پھر اس نے اپنے افسر اعلیٰ سے رابطہ قائم کیا اور اسے تفصیلات بتانے لگا۔"

"لیکن کیا تمہارے پاس کوئی واضح ثبوت ہے کہ یہ وہی شخص ہے جسے ممکن ہے کہ یہ کوئی شرابی ہو اور نشہ کی حالت میں بلواس کر رہا ہو؟"

"ثبوت تو کوئی نہیں ہے جناب میں نے صرف شبہ کی بنیاد پر اسے گرفتار کیا ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔"

"اس کے سامان کی تلاش کی گئی؟"

"جی ہاں سامان کی تلاش لے لی ہے۔"

"اس میں کوئی ایسی چیز زیادہ ہوئی جو مشتبہ ہو؟"

"ہر جی نہیں،" البتہ اس کی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی

بلکہ جوتی ہے جس کی مالیت تقریباً ساڑھے نو ہزار ہے۔  
 ”ہاں۔ یہ تو کوئی ایسا شرت نہ ہوا جو قابل توجہ ہو۔ کوئی پاسپورٹ وغیرہ کوئی ایسی چیز۔۔۔“  
 ”جی نہیں ایسی اور کوئی چیز اس کے سامان سے نہیں بلکہ ہوتی“

”تاہم تم نے غلطی کر لی ہے۔ ہر شے میں آنے کے بعد وہ پولیس پر ہنگامہ عزت کا دعویٰ نہ کرے۔“  
 ”وہ تو ٹھیک ہے جناب لیکن ہمارے گواہ بھی ہیں۔ اس نے خود بخود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ دنیا کا خطرناک ترین مجرم ہے۔ اور وہ ہے جو ایئر پورٹ سے ہنگامہ کر کے ناسیب مراثی تھا۔“

”لیکن اب اس سلسلے میں تم کیا ارادہ رکھتے ہو؟ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پوچھا۔“  
 ”جو حکم ہو جناب۔ میں نے تو آپ کو اطلاع دینا ضروری سمجھا تھا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ اور ہاں تم کسٹم ہوس فون کر کے اس کسٹم آفیسر کے بارے میں معلوم کرو جس کی موجودگی میں یہ ہنگامہ ہوا تھا اور اگر وہ مل جائے تو اسے پولیس اسٹیشن طلب کرو۔ معذرت کرتے ہوئے اسے اصل صورت حال بتا دینا میرا خیال ہے کسٹم والے ہم سے پورا پورا تعاون کریں گے۔ میں نے کہا اور انسپکٹر نے گرفت ملا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایئر پورٹ کسٹم سے رابطہ قائم کر رہا تھا۔ جس کسٹم آفیسر کی موجودگی میں یہ ہنگامہ ہوا تھا وہ اس وقت وہیں موجود تھا اور اس کا نام نیاز احمد تھا۔ پولیس انسپکٹر نے اسے تفصیل بتائی اور کسٹم آفیسر وہاں پہنچنے کے لئے تیار ہو گیا۔“

”تو میں ڈیوٹی پر نہیں ہوں انسپکٹر میری ڈیوٹی رات کو آٹھ بجے شروع ہوگی۔ اس لئے میں پہنچ رہا ہوں۔“  
 ”بہت بہت شکریہ جناب۔ آپ تشریف لے آئیے ہزاری ایک بہت بڑی مشکل حل ہو جائے گی۔“

”جی بہتریں آ رہی ہیں کسٹم آفیسر نے کہا اور ٹیلی فون بند کر دیا۔ اس کے بعد کسٹم آفیسر پولیس اسٹیشن پہنچ رہا تھا۔ ایس پی پولیس بھی پولیس اسٹیشن پہنچ چکا تھا اور اس نے جو ان شخص کو دو تین بار دیکھا تھا جو بظاہر تو نشے میں ملوم نہیں ہوتا تھا لیکن اس کی حرکات غیر عادی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود بہت زیادہ پانسے کو شیش کر رہا ہو۔“

کسٹم آفیسر کا استقبال بھی پولیس انسپران نے برسرِ پاؤں کیا۔

”میں کیا۔ انسپکٹر نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا اور اس نے بھی۔ اسے ہٹانے کے بعد انہوں نے اسے تھوڑی سی تفصیل بتائی اور کسٹم آفیسر اس بات کے لئے تیار ہو گیا کہ وہ اس کی شناخت کرے۔“  
 ”آپ کو یقین ہے کہ آپ اس کو پہچان لیں گے؟ ایس۔ پانے پوچھا۔“

”یقیناً جناب بھلا میں اس شخص کو پہچان سکتا ہوں کسٹم آفیسر نے جواب دیا اور پھر وہ لوگ اس لاک اپ کی طرف چل پڑے جہاں وہ نوجوان موجود تھا۔“

”میری ہے کسٹم آفیسر نے دُور ہی سے اندازہ لگایا۔ اور انسپکٹر اور ایس پی چونک پڑے۔ انہوں نے توجہ نہ لگا دی اور کسٹم آفیسر کی طرف دیکھا۔ اس دوران وہ کچھ اور آگے بڑھائے تھے پھر وہ لاک اپ کے دروازے کے نزدیک پہنچ گئے۔“

”آپ کو یقین ہے کہ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے پوچھا۔ جی ہاں جناب سرسرفرق نہیں ہے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں بلکہ اسے پہچاننے والا میں ہی نہیں بلکہ میرے عملے کے دوسرے لوگ بھی ہر یقینی طور پر۔ یہ میری بات کی تصدیق کریں گے۔“

”اگر یہ بات ہے کسٹم آفیسر تو ہمیں انسپکٹر کو مبارکباد دینی چاہیے جنہوں نے بڑی جانفشانی سے اس شخص کو گرفتار کیا ہے۔ ہمیں اس بڑی شبہ متاثر کرنے میں دوبارہ اس شخص میں کوئی اور نہ ہر۔“

”بالکل نہیں جناب۔ یہ وہی شخص ہے۔ لیکن کیا آپ نے اس کا سامان برآمد کر لیا ہے۔ میرا مطلب ہے وہ دو بکس جن میں سے ایک میں کسٹم بھری ہوئی تھی اور دوسرے میں ماسٹین گن اور دستی بم وغیرہ۔“

”اورہ نہیں ایسی کوئی چیز اس کے کمرے سے نہیں ملی۔“  
 ”اس کا مقصد ہے کہ اس نے وہ چیزیں کہیں پوشیدہ کر دیں کسٹم آفیسر نے کہا۔“

”ہاں جب آپ یہ تصور کر رہے ہیں کہ یہ وہی شخص ہے تو پھر اس نے ایسا ہی کیا ہوگا۔ لیکن ہم سے بچ کر کہاں جلتے گا۔ آپ سے تو عمل آیا اب یہ خود بخود ہی زبان میں ان چیزوں کی نشاندہی کرے گا۔ پولیس آفیسر نے کہا اور پھر وہ تینوں وہاں سے واپس پولیس آفس میں آگئے۔ آفس میں کسٹم آفیسر کے لئے چائے وغیرہ منگوائی گئی اور پھر وہ وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایس پی اور انسپکٹر اس شخص کے لئے آئندہ کا پروگرام تجویز دینے لگے۔ پھر ایس پی نے کہا جتنے یقین ہے انسپکٹر کہ تم اس شخص کی زبان کھلو اسکو گے؟“

”جی ہاں جناب۔ بھلا ہمارے لئے یہ کون سا مشکل کام ہے۔ انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔“  
 ”لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک الجھن بھی ہے انسپکٹر۔ ایس پی بولا۔“

”وہ کیا جناب؟“  
 ”جیسا کہ کسٹم آفیسر نے تصدیق کی ہے کہ یہ وہی ہے جس کے ساتھ کسٹم اور اسلحہ ہے۔ اس کے پاسپورٹ کے بارے میں کبھی کسٹم آفیسر نے کچھ نہیں بتائی تھیں۔ اس لحاظ سے ممکن ہے اس کا تعلق کسی دوسرے ملک سے ہو اور غیر ملکیوں کے ساتھ زیادہ سختی کرنا میرا خیال ہے خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے جناب۔ لیکن ہمیں تو اس کے سامان سے کبھی نہیں ملا۔ ہم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ مقامی ہے یا غیر ملکی۔ اگر اس کی زبان کھل جاتی ہے تو پھر تو کوئی خدشہ نہیں رہتا۔ ہم چیزیں برآمد کر لیں گے اور اس کے بعد بعد کے حالات سے نمٹنا جا سکتا ہے۔ انسپکٹر نے جواب دیا۔“

”ٹھیک ہے انسپکٹر۔ ایس پی ایک گہری سانس لیکر بولا۔ لیکن خیال رکھنا۔ اس کے جسم پر تشدد کے آثار نمایاں نہ ہوں۔“  
 ”بہت بہتر جناب۔ میں پورا پورا خیال رکھوں گا۔ انسپکٹر نے جواب دیا اور ایس پی اٹھ گیا۔ ایس پی کے جانے کے بعد انسپکٹر ساعت سرچتا رہا پھر اس نے گہری سانس لے کر پاؤں پھیلادیے۔“

شام کو تقریباً چھ بجے انسپکٹر ضروری کاموں سے فراغت حاصل کر کے آیا۔ اس کے ساتھ اس کے در ماتحت سب انسپکٹر بھی بیٹھے۔ تب انسپکٹر نے اس شخص کو اپنے آفس میں بلوایا اور وہ اطمینان سے جلایا۔“

”کیا یہ سب مل تھا؟ انسپکٹر نے اپنے ایک ماتحت سے سوال کیا۔“  
 ”جی ہاں جناب۔ اطمینان سے زمین پر پڑا سوراخ تھا۔ ایک سب انسپکٹر نے جواب دیا۔“

”کیوں کیا تمہارا نشانہ آگیا؟“ انسپکٹر نے اس شخص سے پوچھا اور وہ معصوبیت سے انسپکٹر کی شکل دیکھنے لگا۔  
 ”میں نہیں سمجھا جناب۔ اس نے ٹوکے ہوئے لبوں سے کہا۔“  
 ”اور، گویا تمہیں سمجھا نا بھی پڑے گا۔ انسپکٹر نے انداز میں بولا۔“

”میں نہیں جانتا جناب کہ میں کہاں ہوں اور یہ کون سی جگہ ہے۔“  
 اس نے جواب دیا۔

”نشانہ اترنے کے بعد تو لوگوں کو بہت کچھ یاد آتا ہے میرے“

دروست۔ اور اگر تمہارا نشانہ آگیا ہے تو میں تمہیں بہت کچھ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ انسپکٹر بولا۔ اور وہ شخص متوجہ نہ لگا ہوں سے انسپکٹر کی صورت دیکھنے لگا۔ دیکھو میرے دروست یہ جگہ بہت بڑی ہے۔ یہاں بڑے بڑے تیس مارخاں آتے ہیں اور اپنی زبان کھول دیتے ہیں۔ تم نے صبح کی اس مٹی کے بارے میں ضرور سنا ہوگا جسے ماہر آثار قدیمہ کھود کر لائے تھے اور اس کی عمر کے بارے میں مسیح اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ پھر جب وہ مٹی کی زبان کھولانے میں ناکام رہے تو اسے پالیس کے حوالے کر دیا گیا۔ اور پالیس آفیسر نے ہاتھ اس کی صحیح عمر بتادی۔ یہ عمر انہیں مٹی نے ہی بتائی تھی۔

”تم میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم بھی اپنی زبان کھولو دو اور نہ ہم لوگ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کس حیثیت کے مالک ہو۔ ہم ساری حیثیتیں بھول کر صرف اپنا مقصد پورا کر لیا کرتے ہیں اور یہ خرابی ہے ہمارے اند۔“

”لیکن تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ نوجوان نے اسی معصوبیت سے سوال کیا۔  
 ”ہاں۔ اب آئے نالہ راست پر۔ نام کیا ہے تمہارا؟“  
 پولیس آفیسر نے سوال کیا۔

”میرے پاسپورٹ پر میل نام ایڈورڈ تھمب لکھا ہوا ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں کبھی نہیں ہوں۔ تم مجھے صفر کے نام سے پکار سکتے ہو۔“

”وہ۔ صفر۔ انسپکٹر ہنس پڑا۔“  
 ”ہاں۔ میرا یہی نام ہے۔“  
 ”لیکن میرے دوست تم تمہارا یہ نام تسلیم نہیں کرتے چلی تم تمہیں ایڈورڈ تھمب ہی کے نام سے پکارتے گے۔ اور اگر تم چاہو تو صفر بھی کہہ سکتے ہیں لیکن مسافر۔ بتاؤ کہ تم کہاں سے آئے ہو اور وہ دولت اور اسلحہ تم لے کر آئے تھے وہ تم نے کہاں چھپا دیا۔؟“

”تب میرے دوست تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔“  
 نوجوان نے پولیس آفسر سے کہا۔  
 ”کیوں؟ پولیس آفسر نے پوچھا۔“

”اس لئے کہ میں تو ایک تلاش آدمی ہوں۔ جو تھوڑی بہت رقم یعنی وہ مٹرل والوں کو دے دی اور اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔“  
 ”واہ۔ یہ تو تم نے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔“ میرا خیال ہے کہ تم اس طرح سے زبان کھولنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہر تھے ہیں کچھ لوگ جن کے شایان شان ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔ بہر صورت ہم ابھی اس کا بندوبست کرتے ہیں۔“ حرم خاں انسپکٹر نے ایک سب انسپکٹر کو آواز دی۔



جناب: رحیم خان آگے بڑھا آیا۔

بھئی دیکھو ذرا ان سرسبز صفر سے اس دولت اور اسلحے کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔ جہاں ہوں نے کہیں پریشیوں کو دیا ہے بہت بہتر جناب: رحیم خان آگے بڑھ کر لا اور پھر وہ اس شخص کے سامنے پہنچ گیا۔

وہ بدستور اسی معصومیت سے ان سب کی شکلیں دیکھ رہا تھا۔ تب رحیم خان نے تڑپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”اے بھئی، بول دے اب بہت ہو گئی۔ رحیم خان کا ایک ہی بھانپڑا آدمی کا مزاج درست کر دیتا ہے۔ اب تو جلدی سے بول دے استاد۔ ورنہ رحیم خان نے ہاتھ اٹھایا۔ اور نوجوان نے

معصومانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن دوسرے لمحوں میں محسوس ہوا جیسے رحیم خان کا وہ ہاتھ ابھی جگر پر گر رہا ہے۔ جسے وہ

نوجوان کے چہرے پر سرسبز کرنا چاہتا تھا۔

نوجوان کی پراسرار آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی تھی۔ اور رحیم خان کا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ رحیم خان کو اسے طرح

ساکت چھوڑ کر نوجوان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ انسپکٹر اور دوسرے سب انسپکٹر اسی طرف دیکھ رہے تھے لیکن انہیں شاید معصوم حال

کا صحیح علم نہیں تھا۔ تب نوجوان نے ان دونوں کی آنکھوں میں دیکھا اور دستا انہیں بھی اپنے ذہن چھپتے ہوئے محسوس ہوئے۔ پھر

نوجوان آہستہ سے بولا۔

”دیکھو دوستو! میں تمہارا مہمان ہوں اور یہاں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ باقی ساری باتیں اپنی جگہ لیکن پولیس والوں

کا وہ مخصوص انداز مجھے پسند نہیں جس سے وہ جرموں کی زبان کھلواتے ہیں۔ تو ایسا کرو کہ اب مجھے لے جا کر دوبارہ لاگ اپ

میں بند کر دو اور اس کے بعد جو کارروائی تم کرنا چاہو کرتے رہنا لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے جیل پہنچا دو اور میرے کام آج یا زیادہ سے

زیادہ کل تک ہر جانا چاہیے۔“

پولیس انسپکٹر اور دوسرے سب انسپکٹر بھی پتھر کے ٹٹ

ک مانند۔ گت کھڑے ہوئے تھے۔

”مجھے یقین ہے کہ تم میری ہدایت پر عمل کرو گے۔“ جواب

دیا۔ کیا تم میری ہدایت پر عمل کرو گے؟

”ہاں۔“ تم تمہاری ہدایت پر عمل کرو گے۔“ ان دونوں کے منہ سے شینی انداز میں نکلا۔ اور نوجوان نے مسکراتے ہوئے گون گون ہلکی

دہ ایک دوسرے کو کھنٹی کھنٹی سی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے تب نوجوان نے اس سے سب سے پہلے کہا۔ ”ابھی اسی جگہ اسی طرح ہاتھ اٹھاؤ گے پھر اٹھنا۔“

”تم بھی آ جاؤ سب انسپکٹر اور ان لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرو۔“

دوسرے لمحے سب انسپکٹر بڑا کران کے قریب آ گیا تب انسپکٹر نے مردار سے لہجے میں کہا۔

”انہیں لاگ اپ میں لے جاؤ۔ اور دونوں سب انسپکٹر نوجوان کو لے کر لاگ اپ کی جانب بڑھ گئے۔

جیل کی جہاز ریوری میں قیدیوں کی گنتی ہو رہی تھی۔ تمام قیدی آ کر ایک قفس میں کھڑے ہوتے جا رہے تھے اور سامنے ہی سینکڑوں پیچھے پڑی ہوئی کرسی پر جیلر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے سمجھو

فائل پر ایک اور شخص جڑ بٹھو لے بیٹھا تھا اور قیدیوں کے

پہرے کے پیچھے پاکت ان ٹیلی وژن کے ایک سٹاؤنڈ اعلیٰ آفسر اور

ممتاز دانش و ذہن ہاں انڈین حسن لکھتے ہیں: جنرل ضیا الحق برسرِ اقتدار آتے تو جیسے ہر جہاں آتا ہے۔

انہوں نے بھی سیکرٹری انفارمیشن کو ہدایت کی کہ ٹی وی پر میری زیادہ

کو بیج نہیں ہونی چاہیے سیکرٹری صاحب نے اس مسئلے پر غور کرنے

کے لیے ایک بڑی مینٹنگ بلائی، اس میں ٹی وی کے نمائندے کی حیثیت سے

میں بھی شریک ہوا، میں نے گزارش کی، کو بیج کم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ صد کی وہ سرگرمیاں ٹی وی پر نہ دکھائی

جائیں جن میں خبر کا کوئی پہلو نہ ہو۔ مثلاً اسلام آباد سے ان کی راہی یا آمد کے وقت ذرا، آفسران اور سفارتی نمائندوں سے ہاتھ ملانے

کے مناظر، گل دستہ پیش کرنے کی تقریب اور فوجی انسرڈ کے سٹو وغیرہ۔ مینٹنگ میں شریک سب لوگوں نے اس تجویز سے اتفاق

کیا۔ دو گھنٹے بعد مینٹنگ ختم ہوئی تو میں نے گزارش کی کہ ”معد صا“

آج شام سعودی عرب سے اسلام آباد واپس آ رہے ہیں، مذکورہ فیصلے کے پیش نظر ان کی آمد کی کو بیج نہیں ہونی چاہیے۔ مینٹنگ

پر سنا اچھا لیا۔ سب گنگ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد سیکرٹری صاحب کے جوش و جواں بجائے تو فرمانے لگے۔ ”آپ نے یہ پہلے

کیوں نہیں بتایا۔ یہ تو اب دو دو سے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام آباد واپسی پر صدر صاحب کے پرجوش استقبال کی کو بیج نہ

ہم بیکار رہا تھا۔ قیدی بائیس میں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے لیکن پھر ایک قوی ہیکل شخص چند پولیس والوں کے ساتھ وہاں پہنچا اور قیدیوں کی گفتگو ایک دم رک گئی۔

جیلر اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے شخص نے چونک کر اسے دیکھا۔ غالباً یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ قیدی ایک دم خاموش کیوں ہو گئے۔ تب ان کی نگاہ اس قوی ہیکل شخص پر

پڑی جس کے چہرے پر ڈرامی آگ آئی تھی اور صورت سے عجب غلط لگ معلوم ہوا تھا۔ پھر جیلر آہستہ سے بڑھا آیا۔

”پہلے اس کا نام پکار لو، اور دوسرے شخص نے گردن ہلا دی۔“

”فضل خان! جڑ بٹھو چکے ہوئے شخص نے پکارا اور قوی ہیکل شخص کے ہنر میں پر سکڑا ہٹ پھیل گئی۔

اس نئے دوسرے قیدیوں کی طرح جواب نہیں دیا تھا جیلر اور اس کے ساتھی نے چونک کر قوی ہیکل شخص کی جانب

دیکھا اور پھر جڑ بٹھو چکے ہوئے شخص نے اس نام کے آگے ٹک لگا دیا جو اس نے ابھی ابھی پکارا تھا۔

”میں جاؤں صاحب، فضل خان نے بھاری آواز میں پوچھا اور جیلر نے دوبارہ چونک کر دیکھا۔“

”ہاں جاؤ فضل خان آرام کرو۔ وہ بولا اور فضل خان جوابی

ابھی بتا رہا تھا ہنستا ہوا واپس لگ گیا، لیکن چند ہی دم چلا ہو گا کہ اس نے اس نوجوان شخص کو ایک سپاہی کے ساتھ آتے ہوئے دیکھا جو

بڑی معصومانہ شکل بنائے آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا، فضل خان رک کر اسے دیکھتا رہا، سکڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر اس نوجوان

کے سامنے پہنچ گیا۔

”اے بیٹھے کون ہے تو، کیا کر کے آیا ہے، اس نے اپنی گرجا لڑاؤ میں نوجوان سے پوچھا اور نوجوان چونک کر فضل خان کی شکل دیکھنے لگا۔

”کچھ نہیں کیا میرے دوست، اب گناہ ہوں، اس نے جواب دیا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

فضل خان بھدی آواز میں نہیں پڑا تھا۔

”اے نوجوان کی طرح کیوں بول رہا ہے، مردوں کی طرح بول، مردوں کی طرح۔ اور بیٹھے تو سب ہی کہتے ہیں کہ انہوں نے

کچھ نہیں کیا لیکن فضل خان واضح کے گرد سے اصل بات ٹھول کر نکال لیتا ہے۔“ پھر فضل خان سنتی کی جانب بڑھ کر بولا۔

”سنتی ہی اس لڑکے کو میرے پاس لے آنا، مجھے فضل خان نواس طرح کہا کہ جیلر اس کی حکومت ہزار دیکھو وہ نوجوان

کی طرف دیکھے بغیر آہستہ آہستہ آگے بڑھا گیا۔ نوجوان کو بھی دوسرے قیدیوں کی لائن میں کھڑا کر دیا گیا تھا اور کھڑی دیر کے بعد اس کا نام پکارا گیا۔ صفر اور نوجوان نے آہستہ سے جواب بھی دے دیا، وہ

بچہ شریف نظر آ رہا تھا۔ جیلر نے ایک بار پھر نظر اٹھائی تب اس نے جواب دیا۔

اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

”یہ شخص مقامی تو مسلم نہیں دیتا۔“

”جی ہاں جناب۔ ملاحظہ کرو اور روتا ہے لیکن ٹٹی پھوٹی سی۔ میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔“

”آیا کس جرم میں ہے؟“

”پولیس کی طرف سے رپورٹ آئی ہے کہ اسے جیل میں رکھا

جائے۔ ابھی تک جرم نامعلوم ہے، شاید جیلر اس پر ہے۔“

جیلر کے ساتھی نے جواب دیا۔

”کوئی دلالت تو نہیں ہے اس کے بارے میں؟ تم نے اسے

بھی عام قیدیوں کے ساتھ رکھا ہوا ہے، یہ کیا بات ہے؟“

”صرف یہی بات ہے جناب کہ اس کے بارے میں کوئی دلالت نہیں ملتی تھی، بس نوجوان دیکھا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے

عام قیدیوں ہی میں شامل کر دیا۔“

”کون سے تھانے سے آیا ہے؟ جیلر نے سوال کیا اور اس کے ساتھی نے

شاید تھانے کا نام بتا دیا۔ تب جیلر نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا پڑیں گی، کہیں کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔“

لیکن جناب ابھی آپ نے فضل خان کی بات سنی۔ جیلر کے ساتھی نے پوچھا۔

”کیا ہوا فضل خان کو، کیا کہا تھا اس نے؟“

اس طرف آئے انہوں نے کہا اور نوجوان انتہائی سعاتندی سے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس سے قبل وہ جن کو ٹھہری میں تھا وہاں اس کے ساتھ تین اور قیدی بھی تھے لیکن اب اسے جس کو ٹھہری میں پہنچا گیا وہاں وہی قوی ہیکل شخص جن کا نام فضل خان پکارا گیا تھا موجود تھا، یہ کوٹھڑی کافی کشادہ تھی۔ گرام کوٹھڑی ہی میں سے تھی یعنی اسے کسی اعلیٰ کلاس میں شمار نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن دوسری تمام کوٹھڑیوں سے کشادہ تھی اور سب سے بڑی باستر تھی کہ اس کے اندر باستر اور دوسرا ضروری سامان بھی موجود تھا۔ فضل خان اس باستر پر آؤں لٹکاتے بیٹھا ہوا تھا۔ کوٹھڑی کے جنگلے میں تالا بڑا ہوا تھا لیکن سامنے کھڑا ہوا ستیری اس طرح تودھ کھڑا تھا جیسے فضل خان کا ذاتی لازم ہو۔

دو دنوں ستیری جب نوجوان کو لٹے ہوئے اس دروازے پر پہنچے تو وہ ستیری چونک کر سیدھا ہو گیا۔

”کیا بات ہے۔ اس نے بانی دو دنوں ستیروں سے پوچھا۔“

”اسے فضل خان کی کوٹھڑی میں پہنچا دو۔“

”کیا جیل صاحب نے کہا ہے؟“

”ظاہر ہے ہم اسے اپنی مرضی سے لے کر نہیں آئے۔ آنے والے ستیروں نے جواب دیا۔

فضل خان چونک کر اس طرف دیکھنے لگا تھا، اس ستیری نے سلاخوں دار دروازے کا تالا کھول دیا اور فضل خان اس نوجوان کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”آجا بیٹے آجا، آجا آجا اور تالیاں لے کر فضل خان نے تمہارے بلایا ہے۔“

”تراب بالکل محفوظ ہے۔“ چلو بے دروازہ بند کر کے بھاگ جاؤ۔ فضل خان نے ستیروں سے کہا اور اس ستیری نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا جس نے کھولا تھا۔ تین دنوں ستیری واپس لوٹ گئے نوجوان بھگتا ہوا فضل خان کے پاس پہنچ گیا تھا۔

”ابے بیٹھا کیا تو نوجوانوں کی طرح شرمندہ ہے۔ فضل خان ہنستا ہوا بولا اور اس نے نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر چلا پانی پکھینچ لیا۔ نوجوان اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔

”ہاں بیٹا بول دے کیا کر کے آیا تھا اور دیکھ۔ ناتو میں جیلروں اور نالیوں میں دالا، مگر فضل خان کے سامنے جھوٹ بولنے والا دوبارہ کوئی اور جلا نہیں بول سکتا۔ اس بات کا خیال رکھیو،“ فضل خان نے کہا اور نوجوان نے ایک ایک سرسری نگاہ فضل خان پر ڈالی، پھر گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”فضل خان میں سچ کہہ رہا ہوں، میں بالکل بے قصور ہوں، میں تو اس ملک کا باشندہ بھی نہیں ہوں۔ نسلا میں ایرانی ہوں، زندگی لندن، فرانس اور جرمنی میں گزاری۔ اس کے بعد اس

میں آیا مقصد سیر و تفریح ہی تھا، یہاں ان لوگوں نے مجھے میرے ہونٹوں سے گرفتار کر لیا اور اب مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میرا اسلحہ اور کرنسی کہاں ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی چیز میرے پاس نہیں تھی نوجوان نے معصوم لہجے میں کہا۔

”ابے واہ اتنے سارے ملک گھوم لئے ہیں تو نے اتنی ہی مزہیں۔ گریا تو جس طرح ہماری زبان بول رہا ہے اور تیرا چہرہ جیسا ہے اس سے تو تو نہیں لگتا ہے کہ تو اس ملک کا باشندہ ہے مگر ٹھیک ہے تو ایرانی بھی ہو سکتا ہے، پر تو نے یہ زبان کہاں سے سیکھی؟“ فضل خان نے پوچھا۔

”میں بہت سی زبانیں مانتا ہوں، نوجوان نے جواب دیا۔“

”پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے، تیرے چہرے ہی سے پتہ چل رہا ہے۔ مگر یہ لوگ تجھ سے کرنسی اور اسلحہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”میں نہیں جانتا، ان لوگوں نے الزام لگایا ہے میرے عادیہ کہ میں نے اس پر رٹ کھینچ کر اس میں دھاڑا کیا تھا اور وہاں سے ان لوگوں کو ڈانچ دے کر کرنسی اور اسلحہ لے کر نکل بھاگا۔“

”ابے واہ، الزام تو فرسٹ کلاس ہے، کیا سچ صحیح تو نے ایسا ہی کیا تھا؟“ فضل خان نے پوچھا۔

”میں نہیں جناب آپ یقین کریں میں تو ایک سیدھا سادا آدمی ہوں۔ بس زندگی میں کوئی خاص مقصد نہیں ہے اس لئے آوارہ گردی کرتا رہتا ہوں۔ نہ ماں ہے نہ باپ نہ اور کوئی رشتہ دار میں تو اس دنیا سے اتنا لگ ہوں کہ میرا کوئی نام بھی نہیں ہے۔“

نوجوان نے جواب دیا۔

”کیا بکواس کر رہا ہے۔ کوئی نام بھی نہیں ہے تیرا؟“ فضل خان بولا۔

”نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں، میرا نام کسی نے رکھا ہی نہیں۔“

”بچپن ہی سے میں اپنے آپ کو مسافر کہتا چلا آیا ہوں اور اگر کوئی شخص مجھے کوئی نام دے دیتا ہے تو مجھے اعتراض بھی نہیں ہوتا۔“

”مسافر معلوم ہوتا ہے۔ سالے فضل خان سے یہ مسخری نہیں چلے گی، سیدھا ہوجا مجھے نہیں معلوم کہ فضل خان کیا چیز ہے فضل خان نے ہنستے ہوئے کہا اور نوجوان بھی مسکرانے لگا۔

”میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا فضل خان۔“

”یعنی تیرا کوئی نام نہیں ہے؟“

”ہاں۔“

”پیدا ہی ہوا تھا یا نہیں؟“

”یہ بھی نہیں معلوم فضل خان۔“

”اوئے مسخرے۔ ماں باپ نے کچھ تو نام رکھا ہوگا۔ باپ

کا نام کیا تھا؟“

”ماں باپ نے مجھے پیدا کیا مگر فضل خان لیکن پھر فرما ہی نہیں اپنی نعلی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے مجھ سے جان پوچھ لی۔“

”کیا مطلب؟“

”ماں تو اس مدد سے سے اسی وقت مر گئی کہ میں کیوں پیدا ہو گیا۔ باپ نے سرجا کہ اب یہ مصیبت اس کی گردن پر پڑے گی، اس لئے وہ بھی مجھے پھر دیکھ کر زار ہو گیا۔ بس پھر میری پرورش خیراتی اداروں میں ہوئی اور میں نہ جانتے کیا سے کیا بن گیا۔“

”میری بات سن۔ ماں باپ کے بارے میں اس طرح باتیں نہیں کرتے۔ بڑی عظیم ہستی ہوتے ہیں۔“

”اب کچھ بھی مہفضل خان! نوجوان نے گہری سانس لی۔“

”دیکھ سالے نہ جانے کیوں تو مجھے اچھا لگا ہے۔ وہ میں کسی کو منہ نہیں لگاتا۔ فضل خان کے بارے میں تو ابھی کچھ بھی نہیں جانتا۔ یہ جیل والے مجھے قید تو کر لیتے ہیں لیکن جب تک میں جیل میں رہتا ہوں سبکے سبب سولی پر لٹکے رہتے ہیں۔ جانتا ہے۔ میں جیل کو کیا سمجھتا ہوں؟ فضل خان کے موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا سمجھتے ہو؟“

”نہ خیال۔ یعنی ماں کا گھر۔ جب کبھی باہر سے تنگ جاتا ہوں تو جیل آجاتا ہوں آرام کرنے کے لئے اس سے ابھی جگہ کوئی نہیں ہوتی۔ مگر یہ تو بتاتی ہے رشتے دار وغیرہ تو ایران میں ہوں گے! وقتاً فضل خان نے کہا۔

”ہاں۔ اگر کوئی ہوگا تو وہیں ہوگا۔“

”پھر یہاں تیری خبر گیری کون کرے گا؟“

”کوئی نہیں۔“

”فکر مت کر میرے لعل! فضل خان کے ہوتے ہوئے تجھے کسی بات کی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ میں جب یہاں سے جاؤں گا تو تجھے بھی نکال دوں گا۔“

”مجھے بھی نہ نکل دو گے؟“

”ہاں ہاں نکال دوں گا۔ قتل تو کیا نہیں ہے تو نے؟“

”مگر کس طرح فضل خان؟“

”ہا میں ہاتھ کا کھیل ہے۔“ اور میں کل کہہ دوں تو میرے چہرے جیل توڑ دیں گے۔ مگر سچ صاحب نے بوجھا تھا کہ کتنے دن کی جھٹی چاہئے۔ وہ میری سزا کبھی ہی کہتے ہیں۔ میں نے کہا دیا سچ صاحب ڈر ہو جینے کے لئے کبھی رو۔ تو بیٹا ایک مہینہ چار دن ہو چکے ہیں۔ باقی رہ گیا رہ دن۔ تو ان گیارہ دنوں میں آٹھ دن تو میرے ساتھ رہے گا۔ تین دن پہلے میں تجھے یہاں

سے نکال دوں گا۔ اور اس کے بعد بچہ باقی باقی کر رہے گے کہ آئندہ کیا کرنا چاہیے۔ مفضل خان نے کہا۔ اور وہ فضل خان کی صورت دیکھنے لگا۔ یہ شخص اتنا ہی با حثیت ہے تو اسے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے، اس نے سرجا۔

”مگر ایک بات سن لے پیارے۔ فضل خان پھر بولا اور وہ فضل خان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ تجھے اپنا کوئی نام ضرور رکھنا ہوگا پیسے روز فضل خان کے سامنے نہیں چل سکتا۔“

”جو تمہارا دل چاہے فضل خان مجھے نام نہ نہ کہیں اسے اعتراض نہیں ہوا ہے۔ نوجوان نے جواب دیا۔

”تو پھر میں تجھے شیر خان کہوں گا۔ فضل خان ہنسنے لگا اور اس نے گردن ہلا دی۔

”میں نے کہا نا تو تم کہہ گے مجھے پسند ہے۔ ناموں پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”تو ٹھیک ہے آج سے تو شیر خان کے نام سے فٹ۔“

فضل خان اس کے اشاروں پر ہاتھ مارتا ہوا بولا اور اس نے گردن ہلا دی۔ اسی وقت ایک سپاہی سلاخوں کے نزدیک پہنچ گیا۔ انہیں اور سے آیا تھا۔ فضل خان سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”یہ شخص کیا تمہارے پاس رہ گیا فضل خان؟“ سپاہی پوچھا۔

”کیوں کیا تو لہجہ گھلے جانا چاہتا ہے۔ فضل خان انہیں نکال کر بولا اور سپاہی سر کھینچتے ہوئے لوہے اور دھندلکھنے لگا۔

”جیل صاحب نے پوچھا یا تھا فضل خان میں خود تو پوچھنے نہیں آیا۔“

”تو جا کہہ دے اس ماں کے خصم سے کہ وہ میرے پاس ہی رہے گا۔ فضل خان نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور سپاہی جلدی سے واپس چلا گیا۔ نوجوان دلچسپ نگاہوں سے اس عجیب شخص کو دیکھ رہا تھا پھر اس نے گردن ہلا کر ایک گہری سانس لی۔

کافی دیر تک فضل خان خاموش رہا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر جب اس نے نوجوان کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”شیر خان! اس نے نوجوان کو آواز دی۔ اور نوجوان بولنے لگا ہوں سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔ یار نہ جانے کیوں تجھے یہ نام دینے کے بعد مجھے خود شرم آ رہی ہے فضل خان بولا۔

”میرے فضل خان؟“

”ابے شیر دیکھا ہے کبھی فضل خان بولا۔

”ہاں دیکھا ہے۔“

”تو تو خود سوچ۔ تیرے نخرے تو سالے لوڑیوں جیسے ہیں۔“

تیری شکل ہی لوڈوں سے ملتی جلتی ہے۔ اس لحاظ سے تیرا شیرخان  
کچھ اچھا نہیں لگتا مگر سالے اب میں کیا کروں۔ اب تو میں نے تجھے  
شیرخان کہہ ہی دیا۔ فضل خان نے پھر اس کے شانوں پر ہاتھ مارتے  
ہوئے کہا اور نوجوان مہمویت سے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ پھر  
"شیرخان کے لئے کیا کرنا ہوتا ہے؟" فضل خان نے نوجوان کے انداز  
میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔

"بتاؤ، فضل خان ہنس کر بولا۔  
"ہاں ضرور بتاؤ۔"

"یہ سلاخیں دیکھ رہے ہیں، ناسلٹے مورنے کی قوت ہے  
انہیں۔ اس سلاح کے دونوں سرے ایک دوسرے سے  
ملا سکتے ہیں۔"

"مورنے کی قوت؟" فضل خان نے نوجوان سے پوچھا اور فضل خان  
ہنس پڑا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"جاسالے یہ لوڈوں جیسے ہاتھ۔ ان ہاتھوں سے تو  
سلاخیں مورے گا۔ ان ہاتھوں سے تو تیرے شیشے کی چوڑیاں تک  
نہیں توڑ سکتا۔ فضل خان ہنستا ہوا بولا۔"

"تم کہہ کر شیشے کروں؟" فضل خان نے کہا اور فضل خان  
نے پھر ایک گھن گرجا رہا۔

"جا جا کر تیرے یہ مورے بھی دیکھ لوں۔ ذرا آٹھ فضل خان  
نے اس کی کمر ہاتھ مارا اور نوجوان آٹھ کھڑا ہوا۔ چند ساعت کے  
بعد وہ سلاخیں والے دروازے کے قریب تھا۔

دروازے کی سلاخیں تقویٰ ایک ایخ موٹے لوہے کی تھیں  
اور ان کا نفاصلہ ایک دوسرے سے پھر چھوٹا ہی تھا۔ نوجوان نے  
فضل خان کی طرف دیکھا۔ فضل خان بھی دلچسپ نگاہوں سے  
اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دروازے کی دو سلاخیں  
پکڑیں اور انہیں اس طرح ایک دوسرے سے ملا دیا جیسے وہ  
دو ٹول ہاتھوں سے آٹھیں ہیں پھر دیکھا اور آٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے  
پہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ گیا اور  
سلاخیں کی مضبوطی کا اندازہ کرنے لگا۔ پھر اس نے نوجوان کی طرف  
دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سخت حیرت کے آثار تھے۔ کئی منٹ تک  
وہ کچھ نہیں بول سکتا تھا۔ نوجوان خاموشی سے ایک طرف کھڑا رہا  
پھر فضل خان نے گردن ہلائی اور بولا۔

"کیا سچ کہتا ہے؟"

"میں نہیں سمجھا، فضل خان۔"

"سمجھ جاؤ، وہ گھوکے لڑکے اور لوڈوں کا۔ مجھے بتا دے۔"

مگر میں نے فضل خان سے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا فضل خان میں نے انہیں مورے دیا، تمہیں  
تو کہہ رہے تھے کہ شیرخان کی کوشش کروں گا کہ مجھے اس نام سے شہرت  
دے دیں۔"

"مگر میں نہیں مانتا۔ یہ نازک ہاتھ اتنی موٹی سلاخیں کیسے  
مورے سکتے ہیں۔ اور ہاتھ فضل خان نے کہا اور نوجوان نے ہاتھ آگے  
بڑھلایا۔ تب اس نے اپنا چوڑا پنجو پھیلا دیا تھا۔ اسے مورے  
اور نوجوان بھیجتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے  
آہستہ لہجے میں کہا۔

"لیکن فضل خان میں تمہاری عزت کرتا ہوں۔ تمہارے ہاتھ  
میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔"

"نہیں ڈالے گا سالے تو یہ سنبھال فضل خان نے اس کے  
جڑے کی طرف ہاتھ گھمادیا لیکن نوجوان آجھل کر پھینک گیا تھا  
اس کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ فضل خان  
پھر گرا سے گھورنے لگا تھا۔

"میں کہتا ہوں دیکھ میری بات مان لے۔ دروازہ مٹا دے  
غصہ آجائے گا۔ اور پھر میں تمہیں شیرخان سے گیدڑ خان بنانے میں  
کوئی وقت محسوس نہیں کروں گا۔"

"فضل خان دیکھو میں نے تم سے کہا ہے کہ میں تمہاری عزت  
کرتا ہوں۔ اور آدمی جس کی عزت کرتا ہے اس سے مقابلہ کرنے کی  
کوشش نہیں کرتا۔"

"سب ٹھیک ہے مگر میں جانا چاہتا ہوں کہ تو نے  
کس طرح سلاخیں کیسے مورے دیں۔ ان ہاتھوں میں اتنی جان کہاں  
سے آگئی، چل ہاتھ میں ہاتھ ڈال۔ فضل خان نے پھر آگے  
پھیلا دیا۔ اور نوجوان نے بھی ہاتھ آگے بڑھلایا۔ حالانکہ  
فضل خان کے ہاتھ کے سامنے نوجوان کا ہاتھ واقعی زانہ  
محسوس ہو رہا تھا۔ سفید رنگ کا بالوں سے بھرا ہوا خوبصورت  
ہاتھ فضل خان کے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ نوجوان  
نے چند ساعت اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر آہستہ سے بولا۔

"اب میں کیا کروں فضل خان؟"

"مورے سے مورے جس طرح تو نے لوہے کی سلاخیں کو  
مور دیا تھا۔ میں جانا چاہتا ہوں وہ کون سی ترکیب تھی جسکے  
ذریعے تو نے لوہے کی ان سلاخیں کو مور دیا تھا، سالے مجھ تیری  
وہ ترکیب پسند آتی ہے۔ اگر کوئی ٹرک ہے تو مجھے بھی بتا؟"  
فضل خان نے کہا۔

"کوئی ٹرک نہیں ہے فضل خان۔ یہ دیکھو۔ نوجوان نے

کہا اور دوسرے لمحے اس نے اپنے ہاتھ کی قوت فضل خان پر  
صرت کی اور فضل خان کا ہاتھ مور کر اس کی پشت سے لگا دیا  
فضل خان سیدھا ہو گیا تھا۔

چند ساعت وہ نوجوان کو عجیب سی نگاہوں سے دیکھتا  
رہا اور پھر اس نے دوبارہ ہاتھ پھیلا دیا۔

"ایک بار اور مورے میری جان میں اپنی زندگی میں  
پہلے بار شکست کھا رہا ہوں؟"

"مگر فضل خان میں تمہیں شکست دینا نہیں چاہتا۔"  
"اب یہ شکست نہیں۔ اگر تو میرا دشمن ہو تو تو فضل خان

کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ مگر تو یار ہے میرا۔ مورے  
ایک بار اور مورے، ذرا دیکھو، تو یہی تیری پہلی تپلی انگلیوں

میں اتنی جان کہاں سے آگئی۔ فضل خان نے کہا اور نوجوان  
نے دوبارہ اس کے ہاتھ کو مور کر فضل خان کی پشت لگا دیا

و اس نے حوصلے سے۔ خدا کی قسم۔ یار میں نے تیرا انتخاب غلط  
نہیں کیا تھا۔ مگر مجھے یہ تو بتا دے میری جان کہ اس دلیہ پستلے

جسم میں یہ قوت کہاں سے آگئی؟"  
"بس فضل خان جو کچھ بھی ہوں تمہارے سامنے ہوں؟"

نوجوان نے جواب دیا۔

"بہت کچھ ہے یار۔ میں تو تجھے مان گیا اور فضل خان  
نے ساری زندگی میں کسی کو نہیں مانا ہے، لیکن تجھے مان لیا ہے

مجھے خود ہی ہے کہ میں تیرا نام شیرخان رکھا ہے۔ مگر لیجئے  
میں پچھتی نہیں آیا، تو تو جو کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ ذرا تو بتا کہ

تیرے ہاتھوں میں یہ قوت ہے یا پورے بدن میں ہے؟"  
اب گرجا نہیں۔ یہ سلسلے میں کوئی بات کہوں گا فضل خان

نے تو تجھے شہرتی رٹنے کی کوشش کرو گے۔ نوجوان نے ہنس  
کر کہا۔

"نہیں کروں گا یار، مان تو تجھے پہلے ہی گیا ہوں، پلہ بھی  
تجھے بتا دے؟ میں نہیں آدمی۔ اتنے ننھے منے بدن میں اتنی

عزت پرستی ہے تو پھر تو میں تجھے مشینی آدمی ہی سمجھوں گا؟"  
مشینی آدمی نہیں ہوں فضل خان، بس جو کچھ بھی ہوں

تمہارے سامنے ہوں۔"  
فضل خان دیر تک بریشیاں سا بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر

اس نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔  
"تو یقین کر میرے یار۔ میں نے تجھے اس لئے اپنا دوست

نہیں بنایا تھا کہ تو اتنا طاقت ور آدمی ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں  
تھا، بس تو مجھے اچھا لگا تھا۔ مگر اب، اب ہاتھوں میں بدل چکی ہے؟"

"فضل خان تم خواہ مخواہ یہ بات محسوس کر رہے ہو۔ اگر  
میں تھوڑی بہت قوت رکھتا ہوں تو ہر صورت تمہیں اس بات  
سے خوش ہونا چاہیے کہ میں تمہارا دوست ہوں۔"

"ہاں یار میری گردن تو فرسے اُدھی ہو گئی ہے۔ فضل خان  
کو اپنی کاکڑی کا ٹیڑھا۔ ورنہ آج سے پہلے تو صرف فضل خان ہی فضل

خان تھا۔ بیٹھ جا آرام کر۔ مگر ٹھہرے تیرے لئے میں ایک چارپائی  
منگوا دوں فضل خان نے کہا اور آٹھ کر سلاخیں والے دروازے

لے پاس پہنچ گیا۔ پھر اس نے بڑی حقارت سے سنتری کو گھپارا  
اور سنتری اس کے نزدیک پہنچ گیا۔

"ایک چارپائی اور لے آ، بستر کے ساتھ یہیں ڈال دے؟"  
فضل خان نے کہا اور سنتری گردن ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

جیل کی یہ حالت اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی  
تھی جہاں ایک آدمی کی اتنی حکومت چلتی ہے۔ تھوڑی دیر کے

بعد ایک چارپائی آگئی۔ اس چارپائی کے ساتھ معرکی قسم کا  
ایک بستر بھی تھا۔ تب فضل خان نے چائے کے لئے کہا اور

چائے کی پیچ لگئی۔  
"تو دیکھا تو نے یہ پیش ہیں فضل خان کے جیل میں، اب بتا

کیا اسے پستیل کا وقت نہ کہا جائے؟"  
"بلاشبہ فضل خان۔ مگر اب ہم دوسری باتیں ہی تو پوچھ لیں

ایک دوسرے سے؟"  
"ہاں ہاں کیوں نہیں؟"

"تم کیا کرتے ہو؟" نوجوان نے پوچھا۔  
"آڑھ بھاننا، سب سے بڑا آڑھ ہے، پرے شہر میں

کوئی فضل خان کی ٹکر کا نہیں ہے جتنے برعاش ہیں سب  
فضل خان کو بھتہ دیتے ہیں اور فضل خان ان کی حفاظت کرتا ہے

پھوٹے پھوٹے کاموں کے علاوہ کبھی کبھی بڑے کام بھی مل جاتے  
ہیں۔ اور کبھی فضل خان کا دل چاہتا ہے تو بڑے کام بھی کرتا ہے

اسمگلروں سے نفرت ہے، قتل ڈل بھی نہیں کرتا، کیونکہ انسان  
کی زندگی لینا اچھی بات نہیں ہے۔ مگر کسی کو ٹھیک کرنا ہر تو قوت

یہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ میں نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں  
کیا مگر میرے گڑ کے بہت سے قتل کر چکے ہیں۔"

"واہ! گویا تم دولت کمانے کے خواہش مند فضل خان  
دولت لہنے پاس بہت ہے دوست، دولت کی کوئی

کمی نہیں۔ جب باہر نکلے گا تو دیکھ لینا فضل خان کیا چیز ہے؟"  
"فضل خان؟ میں ہی اس ملک میں تم جیسے کسی دوست

کے دل جانے سے بہت خوش ہوں۔"  
"یہاں سے کہیں جانے کا ہے؟"



ابھی نہیں۔ ابھی تو اس ملک میں آیا ہوں۔ بہت کچھ

کرنا ہے یہاں۔  
"ایک بات کہوں شہزاد خان۔ ابھی تو قریب تڑپا  
مقصود نظر آ رہا تھا۔ اب تیرنگ بدل گیا ہے۔ اس کا مطلب  
ہے کہ تو بھی کچھ ہے۔"

"دوست بن گئے ہر فضل خان تو کچھ بتانا ضروری سمجھتا ہوں  
"اگر یار فضل خان کی یہی خواہش ہے۔ دیکھو فضل خان  
تجھے خلوص سے اپنے پاس لایا تھا۔ اس کے دم و گمان میں بھی یہ  
بات نہیں تھی کہ تازندہ سے ایسا نکلے گا۔ اس لئے میرے یار تو کچھ  
بھی نے فضل خان کو اپنا یار ہی سمجھا اور اس سے جو کچھ کہے ٹھیک  
ٹھیک کہنا۔"

"چلو ٹھیک ہے فضل خان ایسا ہی ہو گا۔ ان تو میں اپنے  
بارے میں بتا رہا تھا۔ پہلے میں تمہاری نگاہ میں جو کچھ تھا وہ صرف  
قریب تھا۔"  
"کیا مطلب ہے؟"

"اپنا دھندہ چمک رہی ہے؟  
"کیا ہے؟"

"بس پہلا شرق سیاحت ہے۔ ملک ملک کی سیر کرتا  
ہوں۔ وہاں کی پولیس کو ریشیاں کرتا ہوں۔ مقصد کچھ نہیں ہوتا۔  
بس میں اپنے آپ کو منرانا چاہتا ہوں۔ اور جب پولیس میرے  
ہاتھوں تنگ ہو جاتی ہے تو پھر اسے صاف کر کے کہیں اور چل  
دیتا ہوں۔ میں بس ایک ہنگامہ پسند آدمی ہوں۔"

"اور کسے کمال ہے؟ تازندہ سے ایسا ہو گا۔ میں سوچ رہی ہوں  
کس کا تھا۔ مگر چیل کیسے آگیا؟"

"اپنی مرضی سے۔" نوجوان نے جواب دیا۔  
"فضل خان کی طرح؟" فضل خان ہنس کر بولا۔

"یہی سمجھ لو۔"  
"مجھے یقین ہے۔" اور اب جو کچھ کہے گا اس پر یقین کروں گا۔  
"جو اصل میں چیل آکر یہاں کے لوگوں سے ملنا چاہتا تھا جو  
جرائم کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے دوستی بھی چاہتا تھا اور ان کا  
طریقہ کار بھی جاننا چاہتا تھا۔"

"پورے ہوتے ہیں سالے۔ کوئی بڑا کام نہیں کرتے پوری  
کرلی۔ جیب کٹ لی غصہ آگیا تو قتل کر دیا اور چیل آگئے فضل خان  
نے کہا۔"

"مگر پہلے ہی مرحلے پر تم مجھے مل گئے فضل خان۔"  
"ہاں یار۔ میں بھی خوش ہوں۔ مگر یہاں آکر تو نے بھی کیا کیا؟"

"صرف ہنگامہ۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"مگر پورے پورے تازندہ سے پاس۔ کچھ سامان تھا جس میں  
مقامی کرنسی اور کھڑا سلو تھا۔ چیزیں ہنری جگہ جا کر فروی ہوئی تھیں  
کیونکہ کسی بھی ملک میں فوری طور پر کام نہیں شروع کیا جاسکتا۔  
اس کے علاوہ پولیس کو چونکا کر بھی ضروری ہوتا ہے۔"

"اوسے بد معاش۔ پھر کیا ہوا؟"  
"کاشمیر میں جب کاشمیر کے افسروں نے میرا سامان دیکھا تو  
چونک پڑے۔ کاشمیر میں انہوں نے ایک اور بیکس کھولا تو ایک جھوک  
ہوا اور وہاں پھیل گیا۔ ایسا دھواں جڑو ہوں کو منظر کو کر دیتا ہے  
اور میں نکل آیا۔ پھر میں نے ایک ہونٹ میں قیام کیا اور ہونٹ میں  
رخص کرتے ہوئے ایک لڑکی کو چھڑا۔ مقصد یہ تھا کہ گرفتار ہو جاؤ  
مگر یار بات فریغ دفع ہو گئی۔ مجبوراً ہونٹ کے دھیرے اپنے بارے میں  
بتانا پڑا۔ اور تھانے پہنچ گیا اور پھر وہاں سے چل۔"

"اور نے۔ مگر کاشمیر سامان پولیس کے ہاتھ لگ گیا ہے؟"  
"نہیں، وہ ایک لاکر میں محفوظ ہے۔"

"چھ لاک آئی ہے۔" اب کیا ارادہ ہے؟ فضل خان پوچھا  
"تمہارے ساتھ ہونے کا اور تفریحات کروں گا؟"

"تو چیل آنے کے بعد تو نے نکلنے کی کیا ترکیب سوچی تھی؟"  
"میں تمہیں بتا چکا ہوں فضل خان کہ یہ ساری باتیں میرے  
لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جس طرح میں چیل آیا تھا اسی  
طرح یہاں سے نکل بھی سکتا ہوں۔"

"اے واہ۔" اس کا مقصد ہے کہ فضل خان نوجوان  
تجھے پیش کشیں کر رہا تھا۔ لیکن ذرا مجھے بھی تو بتا کیسے نکلے گا۔ یہ میں  
جانتا ہوں کہ تو آجیل توڑنا بھی چاہے تو چیل کے ان رہ کر یہ سانی  
توڑ سکتا ہے۔ میں جب بھی اس طرح بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں  
تو میرے پیچھے میرے لئے کام کرتے ہیں۔ مگر یہ لگتا ہے کہ تیرے لئے  
یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہے۔"

"ہاں فضل خان، ابھی چند روز تمہارے ساتھ رہوں گا پھر  
یہاں سے نکل جاؤں گا۔ نوجوان نے جواب دیا۔  
"مگر کس طرح؟"

"بس تم دیکھ لینا، میرے پاس ہزاروں روپے ہیں۔ جوں  
نے جواب دیا۔ اور فضل خان ہنسنے لگا۔  
"یار مجھے نہیں معلوم تھا کہ چیل میں مجھے میرا استاد چیل جائیگا  
فضل خان تو رنج منگ اپنے آپ کو ہی استاد سمجھتا رہا۔ اس نے  
کہا اور نوجوان خاموشی سے گردن ہلانے لگا۔ اس نے فضل خان  
کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔"

ان دونوں کے درمیان خوب گھٹ رہی تھی۔ پولیس والے

فضل خان سے ڈرتے تھے اور نوجوان کو بھی وہ تمام ہولناکیوں سے  
ہو گئی تھیں ہر فضل خان، ہر تھیں۔ صبح کو صرف گنتی کے لئے جانا پڑتا  
تھا اور وہ بھی اس شانہ انداز میں کہ جب فضل خان وہاں پہنچتا تو  
نوجوان کا نام بھی پکھلایا جاتا نہ جانے کیوں فضل خان کی اس قدر  
ہیبیت سیٹی ہوئی تھی۔  
پچھلے دن فضل خان نے اس سے کہا۔ "دیکھو میری تراگر  
نکلنا چاہیے تو اب کوشش کر سکتا ہے۔"

"یوں فضل خان ابھی تو تمہیں رمل ہونے میں چار پانچ  
دن باقی ہیں۔"

"ہاں ہاں اس میں کوئی شک نہیں ہے مگر کیا تو میرے  
ساتھ ہی جائے گا؟ فضل خان نے پوچھا۔  
"نہیں فضل خان، لیکن یہاں سے جانے سے پہلے ہم  
دونوں کا علیحدہ ہونا ضروری ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟" فضل خان نے پوچھا۔  
"مطلب یہ کہ میں اس کوٹھری سے باہر نہیں جاؤں گا  
کیونکہ اس طرح پولیس میرے اور تمہارے گھمبھڑ کے بارے میں  
سوچنے لگے گی۔"

"بات تو تو نے صحیح کہی ہے، فضل خان گردن ہلانے ہوا اور  
مگر پھر کریں کیا؟"  
"بڑی آسان سی بات ہے فضل خان۔"

"کیا آسان سی بات ہے؟"  
"تم میری پٹائی شروع کر دو، نوجوان نے سکون سے کہا  
اور فضل خان تجھے منہ بھار کر اسے دیکھنے لگا۔  
"کیا مطلب ہے؟"

"مطلب یہ کہ اب ہم دونوں میں جھگڑا ہو جانا چاہئے۔ تم  
مجھے مارنا شروع کر دو۔ پولیس والے مجھے تمہاری اس کوٹھری سے  
نکال کر لے جائیں گے۔"

"واہ؟" کیا بات کہی ہے؟ فضل خان ہنستا ہوا بولا۔ مگر یار  
میں تجھے ماروں گا کیسے۔ تو تو میرے ہاتھ پاؤں توڑ دے گا؟  
"نہیں فضل خان میری یہ مجال کہ میں ایسی کوئی باتیں کر سکوں  
تمہارے ساتھ۔ نوجوان نے کہا اور فضل خان منونیت سے اسے  
دیکھنے لگا۔

"یار تو اچھا یار ہے دیکھ تو مجھے مار سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں  
کہ تو مجھ سے بہت اچھا مقابلہ کرے گا مگر یہ اچھا نہیں ہو گا فضل  
خان کے لئے۔ پھر لوگوں پر میری ہیبیت ختم ہو جائے گی اور مجھے بڑی  
پریشانی اٹھانی پڑے گی۔"

"تو فضل خان تم سے کہتا کون ہے تم یہ ساری باتیں سنا  
161

کے مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔  
"مگر ایک اور کھن ہے پیارے۔ فضل خان نے کہا۔  
"وہ کیا ہے؟"  
"مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ تو فرار ہو گیا ہے؟  
"بس فضل خان میں دس دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا  
اور پھر اطلاع تمہیں مل ہی جائے گی۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مگر چاہیے کیا کہاں؟"  
"کسی بھی جگہ۔ دیکھو مجھے اپنے اڑنے کے بارے میں بتاؤ  
جب تم رمل ہو جاؤ گے تو میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"بلکہ اس مدت کہ شہزاد خان فضل خان کے ہوتے ہوئے تو  
کسی ایسی جگہ جا کر رہے گا۔ سن، یہاں سے نکلنے کے بعد میرا  
اکبر روڈ چلے جانا۔"

کاڑھ پر چلنا اور میرے اڑنے پر پہنچ کر میرے آدمیوں کو صرف اتنا  
بتا دینا کہ تو فضل خان کا دوست ہے اور فضل خان کے آنے  
تک وہاں سنا چاہتا ہے۔ وہ سب تیرے غلام ہیں جاؤں گے  
تیری دن رات خدمت کوں گے تیری عزت کوں گے تو جوں  
ہو گا کہ وہ لوگ جو تجھے نہیں جانتے تیرے دوست ثابت ہوں گے۔"

"اکبر روڈ نام بتایا تم نے؟" نوجوان نے پوچھا۔  
"ہاں۔"

"بس ٹھیک ہے فضل خان چار شروع ہو جاؤ۔ نوجوان  
نے کہا۔ اور فضل خان کھڑا ہو گیا۔  
"یار دیکھو یہ تیرا ہی ہر حال ہے اسے معاف کر دینا فضل خان  
نے کہا اور نوجوان نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی۔  
دوسرے لمحے فضل خان شیر کی طرح چنگھاڑنے لگا۔ وہ  
گالیاں ہک رہتا اور دوسرے لمحے اس نے نوجوان پر حملہ کر دیا۔  
نوجوان کوٹھری کے ایک کونے میں جا پڑا تھا اور وہ چارہائی ٹوٹ  
گئی جس پر وہ جاگ رہا تھا۔  
"مار ڈالوں گا قاتل کو ڈالوں گا فضل خان دشمنانہ لہجے میں چیخا  
اور سنتری دوڑ کر دروازے کے قریب پہنچ گیا۔  
"کیا ہوا فضل خان رک جاؤ فضل خان سنتری چیخا۔  
جاؤ سنتری ایک بار اور چیخا تھا۔  
"میں اسے مار ڈالوں گا۔ روز اس کتیا کے پتے کو یہاں سے  
نکال کر لے جاؤ۔ چلو کھو لو روانہ۔ فضل خان نے کہا اور سنتری  
جلدی جلدی دروازہ کھولنے لگا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اتنے  
نوجوان کا گردن پڑا اور اسے دروازے سے باہر کھیل دیا۔ نوجوان  
فرش پڑا لگا تھا۔ اس نے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس انداز  
میں اپنے آپ کو پیش کر رہا تھا جیسے یہ پیش ہو گیا ہر فضل خان

سلاخوں کو پکڑے ہوئے اسے دکھاتا رہا۔ اور کئی سنتی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے نوجوان کو اٹھایا اور فضل خان کے ہڑتوں پر سرکھڑ پھیل گئی تھی۔ وہ اس وقت تک نوجوان کو دیکھتا رہا جب تک سنتی نوجوان کو اٹھا کر نہیں لے گئے۔

نوجوان نے اسے سپاہیوں کی گفتگو سننا جملہ تھا۔ وہ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے یہی نتیجہ کی بات ہے کہ اتنے دن کیسے گزر گئے۔

ہاں۔ دیکھو اس بے چارے کی شامت ہی آگئی تھی۔ پتہ نہیں کتنا اراہ ہے۔ زندہ بچ جائے تو خوش نصیب ہوگا۔ یہی سکر ہے کہ اس نے اسے نکال دیا۔ ورنہ خداجا نے کب تک پتہ تار تار؟

اب کیا کیا جائے؟ ہسپتال لے جاؤ اور جیلر صاحب کو اطلاع دیو۔ دوسرے سنتی نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد اسے جیل کے ہسپتال پہنچایا گیا۔ سپاہیوں نے جیل کے ڈاکٹر کو روانہ کے بارے میں بتایا اور ڈاکٹر اسے ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔

لیکن اس دوران نوجوان نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹا رہا۔ پھر جیلر وغیرہ آگئے۔

”ہوش آیا؟“  
”ابھی تک نہیں۔“  
”کوئی بڑی چوٹ ہے؟“  
”بظاہر تو نہیں۔“

”فیصل خان بھی جیل آکر مصیبت بن جاتا ہے۔ اگر آئندہ اسے جیل ہوتی تو میں اسے اس جیل میں قبول نہیں کروں گا۔“ جیلر کی آواز ابھری۔

”لیکن جناب۔ کیا اسے اس کی مرضی کے خلاف کسی اور جیل میں بھیجا جا سکتا ہے؟“

”تب پھر اس کے لئے کھرا اور سوچنا پڑے گا۔“ جیلر نے غصیلے لہجے میں کہا۔ حکام اسے گولی نہیں مار سکتے تو میں کسی دن جیل میں اسے گولی مار دوں گا۔ ویسے اس کی زندگی خطرے میں تو نہیں ہے۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا جناب۔ اگر ہوش نہیں آیا تو پھر اندرونی چوٹ کے بارے میں سوچا جائے گا۔“

جیلر اور ڈاکٹر گفتگو کرتے رہے اور نوجوان دل ہی دل میں مسکاتا رہا۔ وہ اطمینان سے آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نے اسے دو آنکھیں لگا کے جیلر اس دوران چلا گیا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے اسے کسی ماتحت کو آواز دی۔

”یہ ہوش میں نہیں آیا۔“  
”نہیں، لیکن چوٹ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکتا۔“  
”کوئی اندرونی چوٹ بھی ہو سکتی ہے۔ ابھی اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ تم جیلر صاحب کو اطلاع دو۔ اسے ہسپتال بھجوانا ضروری ہے۔ تکہ آکسے وغیرہ نکال کر اسکا علاج ہو۔“

”میں اطلاع دے دوں گا۔“  
”ہاں جاؤ ڈاکٹر نے کہا۔ اور اس کا ماتحت جہا گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد نوجوان کو ایک اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ اسٹریچر کسی دین یا ایمبولنس میں رکھا گیا اور ایمبولنس اسٹارٹ ہو کر چل پڑی۔

نوجوان اطمینان سے اسٹریچر پر لیٹا رہا۔ وہ شاید انتظار کر رہا تھا۔ ایمبولنس سڑکیں طے کرتی رہی، پھر جب نوجوان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ جیل سے کافی دور نکلی آئی ہے تو اس نے سکھوں میں بھری بیڈا کر کے دیکھا۔

اس کے نزدیک ہی دوسرا ہی بیٹھے ہوئے تھے پھر اس نے ایمبولنس کے دروازے کا جائزہ لیا اور پھر اطمینان سے انداز میں گردن ہلائی۔

چند ساعت کے بعد وہ اسٹریچر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دونوں سپاہی غری طرح اچھل پڑے تھے۔

”جوش آگیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ لیکن دوسرے نے اس کی نگاہ نوجوان کی نگاہوں سے ملی اور وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ دوسرے سپاہی نے پوچھا اور چونک کر نوجوان کی طرف دیکھا لیکن نوجوان نے اس کی صورت بھی دیکھ لی تھی پھر وہ آہستہ سے مسکرایا۔ دونوں سپاہی پتھر کے بتوں کی مانند ساکت ہو گئے تھے۔

نوجوان نے اپنے بدن پر سے وہ کپڑا ہٹایا جو اسے اسٹریچر پر ڈالتے وقت اس کے جسم پر ڈال دیا تھا اور پھر ایمبولنس کی سین پر بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایمبولنس میں پارٹین نہیں تھی۔ آگے کی سیٹ پر طرف گولا تیر تھا۔ اس نے ڈرائیور کو آواز دی۔

”ڈرائیور گاڑی روک دو۔ ڈرائیور کا پاؤں بے اختیار کھول پڑ گیا اور ایمبولنس کی رفتار سست ہو گئی۔ لیکن جوڑی ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے آغاز میں ایک عجیب سی سڑکی آگئی۔

نوجوان کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں پیرست تھیں اور ڈرائیور کا ذہن سُن مڑتا جا رہا تھا۔

”سائنے دیکھو، کہیں ایک میٹرنٹ نہ کر دینا۔ نوجوان دیکھے لہجے میں بولا اور ڈرائیور کا رخ ٹھوم گیا۔ نوجوان عقہ سے اسے ہدایت

دے رہا تھا اور چند ساعت کے بعد ایمبولنس ٹرک کے کنارے رک گئی۔

”شکر ہے نوجوان نے کہا۔ اور کچھ اطمینان سے ایمبولنس کا دروازہ کھول کر بیٹھا آیا۔ پچھلے دروازوں پر کس والے ساکت بیٹھے ہوئے تھے اور سائے کی سیٹ پر بیٹھے تھے یہی اسی انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ نوجوان ایمبولنس سے اتر کر چند ساعت اور اصرار دیکھتا رہا۔

ایک بھرا ہوا بازار تھا جس میں ہر جگہ چل پھر رہے تھے۔ وہ مظلوم دکھیں تھیں۔ یہی سب اچھی بات تھی۔ چونکہ نوجوان کو ایک باقاعدہ قیدی نہیں قرار دیا گیا تھا اس لئے اس کے بدن پر اس کا اپنا لباس تھا اور اس لباس کی وجہ سے کسی نے اس کی جانب توجیہ نہیں دی تھی۔

نوجوان تھوڑی دیر تک چلتا رہا۔ وہ پڑ اطمینان نگاہوں سے سڑکوں کی دونوں سمت دیکھتا جا رہا تھا۔ چند ساعت کے بعد اسے ایک جانب ایک رستوران کا بوڑھا نظر آیا اور وہ رستوران میں داخل ہو گیا۔

رستوران میں داخل ہو کر اس نے ایک میز کا انتخاب کیا اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ وہ کھانا کھانے کے ساتھ چائے لالنے کا حکم دیا اور وہ بیٹھنے اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔

نوجوان اطمینان سے چائے پیتے ہوئے کھانا کھا رہا تھا۔ پھر ایک خیال کے تحت اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسے سامنے بنا لیا۔ اس کی جیب تو ساری کڑی نکلی تھی، لیکن اسے کیا پڑا تھی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے دھیر کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال دیں۔

”یوں سمجھو میں نے تمہیں بل اور کر دیا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں جناب آپ نے بل اور کر دیا ہے۔“ وہ دھیر دھیر کھوتے کھوتے لہجے میں بولا اور بل کی بلیٹ اٹھا کر واپس پلٹ گیا۔

اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے رقم واپس لے جا رہا ہو۔ نوجوان آہستہ آہستہ سیٹی بجاتا رہا۔ پھر اٹھ کر رستوران سے باہر نکل آیا۔ اب فضل خان کا اڑھ آباد کرنا چاہیے۔ اُس نے سوچا۔ اور ایک طرف چل پڑا۔

”نے ٹھیک کہا تھا۔ اکبر وہ پہنچ کر نوجوانی فضل خان نے ایک دکاندار سے فضل خان کا اڑھ پوچھا تھا۔ دکاندار کا ہاتھ کام کرتے کرتے رک گیا۔ کیا جیسا ہے تمہارے؟ اس نے تعجب سے کہا۔

”وہ سائے شہر کے پھیلے ہوئے وقت کے نیچے جو کھلت ہے۔“ دکاندار نے بوکھلائے ہوئے سمجھے میں کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ واپس ہی مڑا تھا۔ دکاندار نے اسے آواز دی۔

”دکاندار نے کہا۔ اور بھائی صاحب ۱۷ اور نوجوان ایک گیا۔ اس نے سولہ اعزاز میں دکاندار کی طرف دیکھا تھا۔ اسے بھائی بڑا نہ مانو تو ایک بات بتا دو۔

”دیکھا بات ہے کیسے؟“  
”ہاں فضل سے تو شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں پوچھ رہے ہمارے کا آگے کیسے؟“

”دکاندار نے فضل خان شریف آدمی نہیں ہے۔“  
”ابھی۔ اب بھائی کس سے پوچھا گیا ہے۔ میں اس وقت آئی ہے کیا۔ جگہ جاؤ بھائی کس نے ملانے کہا ہے تمہارے ساتھ؟“

”ہوں۔“ نوجوان ہنست بھینست کر نکلا۔ اور اب میں تمہارے ساتھ مذاق کرنا چاہتا ہوں پھر اس نے دکاندار کا گریبان پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔

”اے۔ اب کیا ہو گیا ہے بھائی صاحب اساتذہ تھیں پھٹ جلتے گل الٹنگ آسم لمان کی بریاؤ گناہ لا رہا ہے۔“

”تم تمہیں بھائی کو بدعاش کہتے ہو۔“ نوجوان نے دکاندار کو لگایا۔ بھئی پڑتے ہوئے کہا۔

”اے۔ کوئی نہ سب بھائی کا ہے۔ کوئی بڑے ہے۔ ہویا۔ امان تھیں تو چھوڑ دو۔“

”میرا نام شیر خان ہے۔ اور فضل خان میرا بھائی ہے۔“

نوجوان غراہا۔ اور دکاندار کا منہ خوف سے پھیل گیا۔

”دکاندار نے بھائی۔ ایک دفعہ وہاں کہو۔“

”معلوم تھا۔ بھائی صاحب سے دھمکا گیا۔“

”آدمی آؤں۔“

”آخرہ فضل خان کے بارے میں کوئی تفصیل بتا رہے تھے۔“

”میں نے کہا تھا۔ اور پھر نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں ہو سکتی۔“

”ہوا بولا۔“

”جدھر دکاندار نے بتایا تھا کہ فضل خان کا اڑھ ہے۔“

”دھت کے پچھے نظر نے والی عبارت وسیع تو تھی لیکن بار سے بد رنگ۔“

”روغن تھی۔“

”کی دیا رہیں کافی ادنیٰ ادنیٰ اور مضبوطی ہوتی تھیں۔“

”چند ساعت اس مہارت کا جائزہ دیا۔ اور پھر وہاں سے کی طرف بڑھ گیا۔“

”دوانے سے جھانک کر اس نے دیکھا تو قریب دکاندار کوئی نظر نہیں آگیا۔“

”تھا پتہ نوجوان اطمینان سے کھلے ہوئے دکاندار سے امداد مل رہی تھی۔“

”سائے ہی تین چوڑی سڑکیاں نظر آ رہی تھیں اور ان کے درمیان میں

ایک اندھانہ شخص یہ دروازہ بند تھا۔ نوجوان نے اس دروازے کو کھک  
 دی اور چند ساعت کے بعد یہ دروازہ کھل گیا۔ ایک لمبے لمبے سیٹھ  
 کے آدمی نے یہ شخص دیکھا اور اس کا چہرہ خشک اور گھبراہٹ سے  
 لگا۔ دیکھا کہ یہ شخص کھل گیا ہے۔ یہ دروازہ کھل کر جھانکنے والے  
 نے سوال کیا اور نوجوان نے کہا کہ میں اس سے بے اختیار نکلا۔  
 نوکر افضل خاں کے دوستوں کے ساتھ آ رہی تھی۔ نوجوان نے کہا  
 نوجوان نے بھاری بھاری میں کہا اور جھانکنے والے کا چہرہ ایک دم  
 سہل ہو گیا۔ اس نے سوال کیا کہ میں سے نوجوان کو دیکھتے  
 اس کے کہا۔

میں فضل خان کا دوست ہوں اور جیل سے بھاگ کر آیا ہوں  
 ان کو لے کر آیا اور ان کو لے کر آیا اور جیل سے بھاگ کر آیا ہوں  
 ملنے سے کہا اور نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اندھا  
 ہو گیا جھانکنے والے نے اس کا شخص اسے پیچھے سے اچھوٹا دیکھا  
 اس کے سر پر بیٹھ کر گرنے لگا۔  
 وہ جیل سے بھاگے ہوئے تھے اس نے اس کا  
 دیکھا۔ وہ اس شخص نے پوچھا۔

میں لاٹری میں نہیں دل کا فضل خان نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے  
 افسے پر ملے جانا اور سیکھ کر جیل کو بنا کر تم فضل خان کے دوست ہو  
 وہ تمہارے ساتھ بہتر سلک کریں گے اور اگر وہ بے رحم نہیں ہیں  
 تو میں ان سے ملتا ہوں اور اس وقت آ جاؤں گا جب فضل خان جیل  
 سے چھوٹ کر آجائیں گے۔

”اور وہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور وہ کون سے  
 ہے اور میں تم سے ملاؤں گا۔ اس شخص نے کہا اور نوجوان اس  
 کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ راستے میں اس نے پوچھا کہ تم کون سے  
 ”فضل خان کا نائب ہے فضل خان کی غیر موجودگی میں  
 لاٹری میں جلا کر ہے۔ اس نے جواب دیا۔

”بھائی! کیا ہے۔ یہ نوجوان نے سوال کیا۔  
 ”فیروز۔ فیروز محمد۔ اس شخص نے جواب دیا اور نوجوان نے گروان  
 بلا دی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رستم کے سامنے تھا جس طے ان میں  
 وہ داخل ہوا تھا اس میں چاروں طرف میز پر بیٹھی ہوئی تھیں اللہ  
 میز پر بیٹھی ہوئی تھیں اور وہ ہر طرف نظر پھیر رہی تھی اور اس میں  
 بہت سی تھیں اور لوگ جیسے ہوتے جوا کھیل رہے تھے۔ سامنے ہی  
 ایک کوزہ بنا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک چوڑے شانوں والا آدمی  
 گروان والا شخص نظر آ رہا تھا۔ وہ فیروز کو نوجوان کو لے کر اس شخص کے  
 پاس پہنچ گیا اور اس نے رستم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ساری  
 شخص جس سے آیا تھا اور وہ رستم سے اس کا دوست بنا گیا ہے۔

”ادھ۔ رستم نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر وہ  
 میں ہوا۔  
 ”جس سے اسے اتنا ہی کافی ہے۔ دوست کہ تم نے خود کو اس کا  
 بتا ہے۔ تمہیں اس سے ہنوش آمدید کہتے ہیں اس کا نام اتنا ہی ہے  
 کہ اس کے بعد پوچھنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی لیکن ہماری آسٹی کے  
 لئے کچھ تھوڑا بہت بنا دو تو تمہاری ہرمانی ہوگی۔  
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں پوچھ کر آیا پوچھنا چاہتے ہو۔ نوجوان نے  
 جواب دیا۔

”اسنا دوست کہاں ملاقات ہوئی تھی اور تم اس کا دوست  
 کیسے بن گئے۔  
 ”جیل میں ملاقات ہوئی تھی پر اس فضل خان والے سے  
 اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کا دوست بن کر رہتا ہوں میری سزا  
 تھی اس لئے میں جیل سے بھاگ کر آیا ہوں۔  
 ”بس بس کافی ہے تم نے جو کچھ بتا وہ ٹھیک ہے اس سے زیادہ  
 ہم کچھ پوچھنا نہیں چاہتے۔ فیروز محمد نامہ عمر ہمان کو کسی آرام کی جگہ  
 تھوڑا دو رستم نے کہا اور نوجوان اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

نوجوان کے لئے ایک محلہ کمرے میں بندوبست کیا گیا تھا۔ اس نے  
 اس جگہ کے پندرہ ایک کا اظہار کیا تھا اور کمرے میں اس کے سامنے  
 گیا۔ نہانے کے بعد وہ تھوڑی دیر تک آرام کرتا رہا اور اس کے بعد اس  
 وغیرہ تبدیل کر کے بال کی جانب ہل گیا۔

جو کے خانے میں تک دھرتے کو جگہ نہیں تھی۔ ساری بڑی بڑی  
 تھیں اور لوگ گھر سے ہوتے تھے۔ نوجوان اندھا مائل ہو گیا اور وہ  
 رستم نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ دوسرے لمحے میں وہ شخص نوجوان کے قریب  
 پہنچ گیا۔

”آپ یہاں بیٹھیں گے جناب۔ میز فرمائی کرادی جائے۔“  
 ”ادھ۔ نہیں۔ میں فرمایاں کا وارنہ لول کا لوجوان نے مسکراتے  
 اس سے کہا اور وہ شخص اس سے کچھ ہٹ گیا۔ نوجوان میز پر لے کر وہ بیان  
 سے گزرنے لگا پھر ایک جگہ وہ ٹھہر گیا۔ پانچ آدمی گمشدہ جیل  
 رہے تھے۔ ان میں تین تو سیدھے سادے لوگ تھے جن کے سامنے بیک بگ  
 رکھے تھے لیکن دو قابل فوج تھے۔ ان میں ایک چوڑے شانوں والا اور  
 چھپے چھپے جیسے خود مال کا درسیا ہوا آدمی تھا۔ دوسرے نوجوان تھا اور  
 جسمانی طور پر وہ بھی پختہ نظر آتا تھا۔ ان دونوں کے سامنے لوگوں کے اشارہ  
 لگے ہوئے تھے۔ اور ان کے مقابل کھینے والوں کے چہرے اترتے ہوئے تھے۔

نوجوان رنگ کر چلی ہے۔ ان کو کھیل دیکھتا رہا اور پھر یہاں سے  
 ہٹ گیا۔ تین اب اس کا شہکار کی طرف تھا۔ رستم جو گہری نگاہوں  
 سے پلے اس کی نگاہی کر رہا تھا اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔  
 ”اسا خیر خاں کے اس نے مسکراتے ہوئے گروان سے کہا۔

”ایک بات بتاؤ رستم۔  
 ”مجی استناد۔  
 ”رکیشن پر کھیل ہوتا ہے۔  
 ”وہاں استناد۔ میں بیٹھا۔  
 ”بے کھلاڑی بھی ہیں۔“  
 ”مد آپ کا مطلب ہے شاپرے؟ رستم نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“

”وہ جسے استناد ہی نہیں رکھنے دینے سائل کو۔ لڑکی کے لئے  
 بھی بہت سے آئے مگر اس نے بھگا دیا۔ استناد ایک اصول ہے۔“  
 ”کیا ہے۔“

”بس۔ بیس بیٹھا۔ دراصل استناد بڑے کاموں میں بھی بے  
 ایمانی پسند نہیں کرتے۔ رستم نے جواب دیا۔  
 ”یہاں شاپرے نہیں ہوتی۔“  
 ”بگڑ نہیں استناد۔“  
 ”اور لڑکی کرے۔“  
 ”وہ بھی کرے منہ لاکر کے کمال دیا ہوتا ہے۔“

”ادھ۔ نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں  
 میں ایک شرمخ جگ اہلنے لگی تھی۔  
 ”دیکھو! یہ چہ ہے ہوا استناد؟ اب رستم نے پوچھا۔  
 ”وہ شاپرے ہوتی ہے۔“  
 ”کہاں۔ یہ رستم جو کسوٹ۔“  
 ”جیل میں نہیں پوچھو۔ یہ نوجوان نے جواب دیا۔ اور تڑپتی نگاہوں  
 اس طرف اٹھ گئیں اور پھر اس نے ہاتھ اٹھایا لیکن نوجوان نے اسے  
 روک دیا۔ ”فراموش کرو رستم۔“

”کس سامنے کی یہ مجال ہوئی۔ ہاں لوگ بڑے اعتماد سے  
 آتے ہیں اور صرف کھیل کھیلتے ہیں۔ رستم بگڑ کر بولا۔  
 ”وہ دونوں کون ہیں۔ میری مراد اس شخص سے ہے جو چوڑے  
 کندھے والا ہے اور دوسرا نوجوان آدمی۔ دونوں پارٹنر ہیں۔“

”اسے ان سائل کی ایسی بیسی اور ان کی میز پر ٹوڑے سحر لوگ  
 بیٹھے ہوتے ہیں کہ یہ انڈیو ٹوڑا لالہ ہیں ابھی چیک کرتا ہوں تو توڑتے کہا  
 ”تھیک ہے۔ پہلے چیک کرو۔ تمہارے ہاں ماہر تو ہوں گے۔“  
 ”ہاں۔ رستم نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے رستم کے قریب پہنچ گیا۔  
 ”دیکھ کر رہے ہو تم ہاں میں؟ رستم غرا۔  
 ”کون کون ہے استناد۔“

”میز پر نہیں کو چیک کر کے رپورٹ دو۔“  
 ”ادھ۔ اچھا۔ اس شخص نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ہٹتا  
 ہوا وہاں پہنچ گیا۔ کئی منٹ تک وہ کھیل کا آغاز نہ لیتا رہا۔ اور پھر واپس  
 پلٹ آیا۔

”ہاں کیا رپورٹ ہے استناد۔  
 ”دیکھیں ٹھیک ہے ہاتھ استناد۔  
 ”ابھی طرح چیک کر لیا ہے۔“  
 ”ہاں استناد۔ اس نے جواب دیا اور رستم نے نوجوان کی طرف  
 دیکھا۔ نوجوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”بلائیڈ کارڈ کچھ ملتا ہے۔ ہاں پھر سے دیکھو۔ لوجوان بولا۔  
 ”کس طرح کچھ ملتا ہے۔“  
 ”جاؤ دیکھو۔ غم سے دیکھو۔ یا رستم۔ ہاتھ ماہر لوگ  
 ”دو ہاں استناد۔ مگر فیڈا تقییل بتاؤ۔“  
 ”مجھ تک لاؤ۔ ہاتھ میں رہتے ہیں ان کی انگلیاں چلتی رہتی  
 ہیں اور وہ دوسروں کے تپیل میں سے اچھے پتے کھینچ لیتے ہیں۔“  
 ”ان دیکھو دوسروں کو تپتے نہیں جیتا ہے۔ رستم نے جب سے پوچھا  
 ”یہی ان کا فن ہے۔“

”میں ابھی ان فنکاروں کی ایسی تپتے کرتا ہوں۔ رستم نے کہا اور  
 خود کا نوٹ کے پیچھے سے نکال کر نوجوان کے ہاتھ پر رکھا۔ رستم اس فن کو  
 نے گرو چکارتا ہوا ہاں بیچا جیسے کسی شخص میں بگڑ رہا ہوا پھر وہ اس  
 میز پر کھڑا ہو گیا۔

”دوختا اس نے کھینے والوں میں سے اس نوجوان کے خاندان پر  
 ہاتھ رکھا اور جسمانی طور پر وہ معلم ہوتا تھا۔ پھر اس کی گرفت کیوں گہرا  
 ”یہ کیا ہوا ہے۔“ نوجوان جو تک رستم کو نہ بیچنے لگا۔  
 ”ہاتھ ہاؤ۔“ وہ غرا یا لیکن رستم نے اس کی جڑ سے پھینکی تھی۔  
 ”دیکھو۔ ہوا ہوا۔ وہ بولا۔

”دیکھو بات کیا ہے اور تم کون ہو۔ چوڑے شانوں والے شخص کو  
 صورت آدمی نے رستم کو دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”دیکھو! کاتھم۔ اس لوگ یہاں صرف اس لئے آئے ہیں کہ یہاں کا  
 کھیل دیا تدارکی سے ہوتا ہے۔ رستم نے جواب دیا۔  
 ”جوا۔ اور دیا تدارکی سے ہے۔“  
 ”ہاں۔ یہاں کا اصول ہے یہ۔“

”لیکن ہم کیا بددیانتی کر رہے ہیں۔ اسے میاں اس کی جرسی  
 چھوڑو۔ وہ مشینی انسان ہے۔ چوڑے شانوں والا بولا۔  
 ”تم ان لوگوں کے سامنے۔ کسے چوڑے ہاتھ کا لڑا کھیلنے ہوا۔  
 ”اور یہ لوگ جیسے اندھے ہیں۔ چوڑے شانوں والا اس غرا۔  
 ”اور پھر ایک دم سنجہ ہو کر بولا۔ ”تم نے ابھی تک اس کی جرسی نہیں  
 چھوڑی۔“

”یہ فضل خان کا اٹھ ہے دوست۔ اور تمہاری سزا یہ ہے کہ تمہیں  
 سزا دیا جائے گا اور پھر تمہارا منہ لاکر کے یہاں سے نکال دیا جائے گا۔“  
 ”کیسی بگڑے شانوں والے نے نوجوان آدمی کو مخاطب کیا۔



جیل سے لے کر میری تم سے کوئی دشمنی ہے رستم؟ شیرخان نے پوچھا۔  
 وہ دشمنی۔ فلاں کرے۔ کیوں لے؟  
 "میں جیل سے بھاگا ہوں۔ تم مجھے واپس جیل پہنچا پوچھا۔  
 پھر، نوجوان نے اس کو کہا اور کہنے والوں کے پیچھے زبان بولی۔  
 "مشرقیہ ہوں اسرارے۔ بھول گیا۔"  
 وہ تم لوگ جاؤ اور فضل خان کو سناؤ۔ شیرخان نے کہا اور ہم  
 چلا گیا۔ تقریباً بارہ بجے وہ لوگ فضل خان کو سنا دے واپس آئے فضل  
 خان پھولوں سے لدا ہوا تھا اپنے اڈے پر پہنچ کر وہ نوجوان سے بولا۔  
 "اوتے فرسے۔ اوتے کھلام۔ کیسا ہے میرے بارے میں پوچھ کر  
 دیا پولیس کو۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی یہاں۔"  
 وہ نہیں فضل خان۔ ہنسا سے سامنے سمجھتا ہے۔  
 "اوتے تو نے یہاں بھی کمال کر دکھایا۔ میں نے تیرا نام غلط تو  
 نہیں لیا۔ سنا ہے تو نے غلط نام لگوں کی مار دکھائی تھی۔"  
 "وہ کوئی خاص بات نہیں ہے شیرخان۔ بس وہ دو لوگ تھلے  
 اصل توڑ ہے۔ کتے میں نے انہیں ٹھیک کر دیا۔"  
 "دیر فضل خان کی تو عیب ہو گئی ہے۔ ایسا درست فلاں کہہ  
 ملتا ہے۔ فضل خان بہت خوش ہے۔"  
 "لیکن میں خوش نہیں ہوں فضل خان۔ شیرخان بولا۔  
 "اوتے۔ کیوں۔ کیا بات ہے؟  
 "میرے تہہ رات ہے فضل خان لے لے  
 "ہاں۔ بستی فدا کی ہے۔ مگر؟  
 "یہاں دوسرے غمناک لوگ بھی رہتے ہوں گے۔ میرا مطلب  
 ہے بزمعاش، چور و خونی اور گوریزہ ہے۔ نوجوان نے پوچھا۔  
 "ہاں بال کیوں نہیں۔ ایک لفظ فضل خان تو فدا کی تھائی میں  
 نہیں ہے۔"  
 "لیکن شیرخان ایسا ہے فضل خان۔ نوجوان شیرخان نے کہا  
 اور فضل خان نہ سمجھنے والی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔  
 "میں نہیں سمجھا شیرخان۔ اس نے کہا۔  
 "شیرخان اس ملک کا اس شہر کا سب سے بڑا مجرم ہے اور  
 جہاں شیرخان ہوگا ہاں کوئی دوسرا مجرم نہیں ہوگا۔ شیرخان نے کہا  
 اور فضل خان کالوں کو ہاتھ دھو لے لگا۔  
 "اوتے فلاں سے فلاں۔ فلاں شیرخان۔ یہ غمناک بات ہے  
 وہ نہیں۔ فضل خان! غمناک بات نہیں ہے۔ ایک حقیقت  
 ہے جو کہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں اس ملک کے تمام جرائم پیشہ لوگوں کو مجرم  
 کرنا چاہتا ہوں؟  
 "مگر کھیل۔ وہ تمہارا کیا لگا ہے تم سے؟"

دوسری میری ہالی ہے؟  
 "خود پھر کیا کرو گے؟"  
 "مجرم ختم کر دوں گا؟"  
 "مجیب بات کہہ رہے ہو اور مجرم بھی کسی ختم ہوئے ہیں۔  
 دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر دور میں جرائم ہوتے رہے ہیں۔  
 "ماتا ہوں۔ لیکن کسی بھی ملک پر صرف ایک حکمران ہوتا ہے؟"  
 "جیہوہیت کا دور ہے۔ غلام۔ فضل خان اس کو بولا۔  
 "سیاست کی دنیا میں جرائم کی دنیا میں ابھی ایسا کوئی کالوں نہیں  
 رہے۔ جرائم کا شہنشاہ ایک ہی ہونا چاہیے۔  
 "اور وہ شیرخان ہوگا۔ فضل خان اس کو بولا۔  
 "ہاں۔ شیرخان ہوگا۔ نوجوان نے سخت لہجے میں کہا۔  
 "اور فضل خان کیا ہوگا؟"  
 "دو فضل خان شیرخان کا دوست ہے۔ اس کا ماننا ہونا ہے۔  
 "اوتے شیرخان تیری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ جو کہ ہے  
 صاف صاف کہہ بارے، فضل خان گردن جھٹک کر بولا۔  
 "میں صاف الفاظ میں کہہ رہا ہوں فضل خان۔ اس شہر میں  
 شیرخان موجود ہے یہاں اور کوئی مجرم نہیں ہے۔ مجرم باقی رہے گا  
 وہ شیرخان کا خادم ہوگا اور کوئی جرم شیرخان کی مرضی کے خلاف نہیں کیے گا  
 "مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ فضل خان نے پوچھا۔  
 "یہی تو میں ممکن بناؤں گا؟  
 "اوتے بارے جزیرہ دل چاہے کہہ کر کوئی ایسا کام مت کرنا جو فضل  
 خان کی نہ سنبھال سکے۔ فضل خان ہاتھ اٹھا کر بولا۔  
 "مجھے تمہارا تعلق بھی دکھا رہا ہے فضل خان۔"  
 "جو تو کہے گا میں کر دوں گا تو ایسا سمجھ میں نہیں آتا۔ چوہے کی طرح  
 آیا تھا لیکن شیرخان بن گیا؟"  
 "میں یہاں مجرموں کا تیم نامہ کھونا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے  
 مجھے کوئی عمدہ اور کشادہ عمارت دکھانے ہوگی۔"  
 "مجرموں کا تیم نامہ؟ فضل خان ہنسا بھرا کر فرس بولا۔  
 "ہاں۔ وہ مجرم جنہیں میں جرائم سے روکوں گا کہاں جائیں گے۔  
 آخر انہیں کھانے پینے اور سنی گزارنے کے لئے کچھ چیزیں دکھانے  
 وہ انہیں اس عمارت سے ملیں گی۔ میں جرائم کو ختم کر دوں گا؟  
 "اوتے میرے بھائی لیکن مجرم کو ختم کرنا پولیس کا کام ہے۔"  
 فضل خان بولا۔  
 "مجھے تمہارے خلاف ہے فضل خان۔ شیرخان بڑا سا منہ بنا کر  
 بولا۔  
 "دوسرا مطلب؟"  
 "پولیس جرائم کو ختم نہیں کرتی۔ میں اس بحث میں نہیں ہونا  
 چاہتا۔ لہذا جو میں چاہتا ہوں کر دوں گا؟"

مداب مجھے تیرے ہاتھ میں خینک سے ٹوڑ کر ناچرے کا نفل خان  
 نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔  
 "میرا غمناک کر کے فضل خان۔"  
 "دو دیکھو بار۔ فضل خان نے کوئی ٹری تعین نہیں مہاسل کی لیکن  
 غمناک تیرے سب سے بڑی تعلیم ہتھ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں تیرے اندر  
 کوئی اور چیز چھپا ہے؟"  
 "نوجوان تھوڑی دیر تک سوچا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر  
 بولا۔ میں تمہارے اس خیال کی توجیہ نہیں کر دوں گا فضل خان۔ تم جس  
 دوست ہو۔ اپنے ہاتھ میں ہتھیں کافی حد تک بنا چکا ہوں۔ ہاں باپ کی  
 موت کے بعد کی زندگی بڑی اذیت ناک تھی۔ جرائم کی دنیا کی طرف اپنے  
 شوق سے نہیں آتا تھا حالات لائے تھے میرے ذہن میں شدید خواہش  
 تھی کہ کوئی سہارا مل سکے اور میں اس زندگی میں نہ آؤں لیکن مجرم  
 عام انسانوں کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے لئے جرائم کا میدان تیار کیا جاتا  
 ہے۔ اور پھر نیک زندگی کے سانسے راستے بند کر دیے جاتے ہیں۔ مجھے  
 ساری دنیا کے مجرموں سے سہاویہ دی ہے۔ میں انہیں چھائیوں کی زندگی  
 کی جانب ہانپتا ہوں اور یہی میرا مشن ہے۔ میں مجرم ہوں فضل خان  
 لیکن میں چاہتا ہوں کہ دنیا میں میرے علاوہ کوئی مجرم نہ رہ جائے۔"  
 "اوتے خدائی خوار تیرے سینے میں اتنا خوبصورت دل ہے؟"  
 فضل خان حیرت سے بولا۔  
 "اسے خوبصورت دل منت کہ فضل خان۔ میں تو خود کو انسان  
 سمجھتا ہی نہیں۔ دل جیسی چیز تو انسان کے پاس ہوتی ہے۔ میں نے  
 بڑی محنت کی ہے فضل خان۔ میں نے بڑے شعبہ سے کیے ہیں۔ مثلاً اگر  
 میں چاہوں تو تمہاری جیب سے کھینچوں گا چھتہ بڑا دل ہو جائے۔ پھر  
 نوجوان نے کہا اور ایک فضل خان کی جیب پھول گئی۔ دوسرے لمبائی  
 کی جیب سے شہسک کھینچا اور نئے لگس اور فضل خان کا منہ تعجب سے  
 پھیل گیا۔  
 "اوتے۔ اوتے۔ کاٹ لیں گی۔ خدا قسم کاٹ لیں گی۔ لوگوں کو  
 روکو۔ فضل خان اپنی جگہ کھڑے کھڑے چیخا۔ وہ اہل بل اس نے نہیں  
 رہا تھا کہ کہیں کھینچاں اس کے جنبش کرنے پر اس سے چیخ نہ جائیں۔  
 "نہیں۔ لا لیں گی فضل خان اس لئے کہ تم میرے دوست ہو۔"  
 شیرخان ہنسا ہوا بولا لیکن فضل خان کی باج برہنی ہوئی تھی۔ وہ اس  
 وقت تک سکتا رہا کہ کھڑا رہا جب تک آخری تکھی بھی اس کی جیب سے  
 باہر نہ نکل گئی۔  
 "نوجوان نے آگے بڑھ کر چھتہ اس کی جیب سے نکال لیا اور پھر  
 اسے ایک طرف ڈال دیا۔  
 "خدا کی قسم تو۔ نوجوان دگر ہے۔ تو جاؤ گے شیرخان۔"  
 "وہ نہیں فضل خان۔ ضرورت آجیگا اس کی مال ہے۔ میں ایسے شہنشاہ  
 شعبہ سے جیب میں رکھتا ہوں۔ اگر میرا کام سخت مشکل ہو جائے تو نوجوان

کہا اور فضل خان گردن جھٹکے لگا۔ کافی دیر تک وہ بکھلایا رہا۔ پھر لپٹا۔  
 لیکن شیرخان۔ میرے دوست۔ میں نے بیٹ مان کر کوئی  
 لکھتا ہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ مگر تو ساری دنیا کو اس طرح بدل سکتا  
 "ساری دنیا کو تو صرف خدایا ہی بدل سکتا ہے فضل خان۔ میں تو  
 جن لوگوں کے کام آؤں تو مجھے خوشی ہوگی۔"  
 "مجرموں سے تو بڑی خدائی شہری بڑی ہے۔ کیا تو سولی تم کے  
 چوراہے کیوں سے بھی باز پرس کرے گا۔ غمناک کو کسی مارے گا۔"  
 "نہیں فضل خان۔ انہیں سے تو مجھے سہاویہ ہے۔ بڑے مجرم تو  
 میرا شکار ہوں گے۔ وہی ان بچاؤں کے لئے بھی زندگی ہتھیا کر رہے گے۔"  
 "اوتے۔ تو تم ان لوگوں سے ٹکرانے کا ارادہ بھی رکھتے ہو؟  
 "ہاں فضل خان۔ نوجوان نے جواب دیا اور فضل خان گہری  
 سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔  
 "بہر حال فضل خان تیرے لئے ہر کام کرنے کو تیار ہے۔ بول مجھے  
 کیا کرنا ہے؟"  
 "سب سے پہلے میرے لئے ایک عملت کی تلاش ہے۔"  
 "لیکن عمارت خریدنے کے لئے دولت کی ضرورت ہے۔  
 فضل خان بھی بہت سے لوگوں کو پاتا ہے۔ وہ اتنی بڑی رقم؟"  
 "میں تمہیں بتا چکا ہوں فضل خان۔"  
 "دیکھا؟"  
 "ایئر پورٹ کمرے کے صفر کے پاس کرنسی بھی دیکھی تھی اور اسلحہ  
 بھی۔ اور غلط تو نہیں لکھتا تھا ان بے چاروں نے۔ تو میرے پاس بھی  
 کافی دولت ہے۔ میں اپنے کاروبار کے لئے بڑی مشین خرید سکتا ہوں۔  
 بس میری پسند کی جگہ مل جائے۔"  
 "دلت ہو پھر تو کوئی نام مشکل دے۔ فضل خان نے گردن  
 ہلاتے ہوئے جواب دیا۔  
 "دلت کا اسم لکھا کوئی تمہارے جیب سے نہیں نکلی۔ اس جیل میں  
 خود اس کی نگرانی میں بہت سے مجرموں کو پھانسی ہو چکی تھی۔ یہ خطرناک  
 لوگ معاشرے کے چہرے کا ہڈیاں ناخ ہونے میں اس کے وجود سے مدد  
 پاک ہوئے تو اس سے اسی بات کو کہتی ہوتی ہے۔ خود جیل کا بھی یہ نظریہ  
 تمامہ قانون کا محافظ تھا۔ قانون کی برتری چاہتا تھا۔"  
 لیکن محمد خان۔ تیس بیس سال کے اس کو دل جوان کے لئے  
 جیل کا دل دہا تھا۔ جانے کیوں۔ وہ قتل کا مجرم تھا۔ اس نے ایک  
 دینار کو قتل کیا تھا۔ دینار کے بہت بڑے زینلے کو اور زینلے کے بچوں  
 نے اسے پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا تھا۔ محمد خان کو دوسرے دن صبح  
 پھانسی ہوئی تھی۔ صبح سات بجے اسے دینا چھوڑ دینی تھی۔  
 محمد خان ایک سال سے اس جیل میں تھا۔ ناموش فطرت اور  
 نیک عقیدت کا انسان جیل کو کبھی اس سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن  
 ماہ تک اس نے جیل کی کوئی برہمی کام کیا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک اچھی فطرت کا



انسان خدا رحیم کو اس سے اکتیت ہو گئی تھی۔ کئی بار اس نے محمد بن کے اس کے ماملت پر پھینکی اور شمشیر کی تھی لیکن محمد بن اسکر کرف سوشن ہو گیا تھا۔ ایک بار اس نے کہا تھا۔

”جسے زخم میں جیلر صاحب ساگر مجھ سے آپ کو کوئی نکلیت نہیں ہوتی تو اس کے صلے میں ان زخموں کو زکریا میں سمجھا اس ناموشی پر معاف کریں۔ اور اس کے بعد جیلر نے اس سے اس کی فالت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا۔

لیکن بھاشی کی منزلت کے بعد جیلر کے دل میں ہلکا سا خیال اُبھر رہا تھا کہ اگر محمد بن گناہ ہی مرحلتے گا اس کو لڑکھائی نہ معلوم ہو سکے گا۔ یہ پہلا جرم تھا جس کے لئے جیلر ت کو ایک بے تک نہ سوکھتا۔ اور جب بے چینی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو جیلر نے کوسے سے نکل آیا۔ اس نے وہی پہنی اور اپنی رہائش گاہ سے نکل کر جیل کے اس تختے کی طرف چل پڑا جہاں کال کو ٹھہرا ہوا تھیں۔ تنگ و تاریک کو ٹھہریاں جہاں منزلت موت کے قیدی رکھے جلتے تھے۔

پھر جیلر دل سے سلوٹ لینا ہوا بلا خودہ محمد بن کی کوٹھری تک پہنچ گیا۔ اندر سے آئی ہوئی روشنی کی چند کرنیں محمد بن کی کوٹھری کو روشن کر رہی تھیں اور اس روشنی میں محمد بن نظر رہا تھا۔ وہ جیسے میں پڑا ہوا تھا۔

جیلر کے دل پر عجیب سا اثر ہوا۔ اللہ اس کے سجدے سے اٹھے اور انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد محمد بن اٹھ گیا۔ غائبانہ نماز پڑھ رہا تھا جب اس نے سلام پھیرا تو اس کی نگاہ جیلر پر پڑی۔

”دکھن۔“

یہ شاید جیلر سے واضح طور سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ میں جیلر سول محمد بن کی جیلر کی آواز لکھری اور محمد بن نے اسے سلام کیا۔ پھر وہ اٹھتا ہوا سلاخوں کے نزدیک آ گیا۔

”آپ کی لوگی بھی بڑی سخت ہے جیلر صاحب نہ دن کو جیلر اللہ نہ رات کو آرام۔ اس وقت شاید آپ یہ دیکھتے تھے کہ میں کو محمد بن چل رہے تھے کی کو شمشیر میں تو صرف نہیں ہے۔ تو جیلر صاحب جیلر تو میں تو جیلر کا ہوں۔ سناں جگر ایک جگہ پر میں آئے ہوں جو بائیں کا۔ یہ برائیاں نہ ہی روح ہی آئی۔ وہ مسکرانے لگا۔

کسی منزلتے موت کے جرم کو جیلر نے اتنا سکون اور جھٹکا کہی نہیں دیکھا تھا۔ یہ حیرت ہوتی اللہ ہگری انکا اہل سے محمد بن کا جائزہ لینے لگا۔

”نماز پڑھ رہے تھے محمد بن کیلئے“

”ہاں۔ آخری وقت میں سلمان ہونے کی کو شمشیر کر رہا تھا وہیے جیلر صاحب آپ بیک پر مجھے بھی دیکھنے کے لئے بھیجنا؟“

”نہیں محمد بن۔ تم جانتے ہو میں نے کبھی نہیں پڑا ان میں سمجھا۔ اللہ تمہارے ساتھ جیلر میں کئی بڑا سلوک ہوا۔ دل تو جاتا ہے کہ تم سے بہت سی باتیں کر دلیں لیکن جاتا ہوں میں تمہارے اور خدا کے درمیان

نہیں آؤں گا“

”باتیں کریں جیلر صاحب۔ میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ آخر کی باتیں کر دوں۔ آپ آگے آپ کی بہت مہربانی“

”وہ میں نے تم سے تمہارے بارے میں کئی بار پوچھا محمد بن۔ لیکن تم نہیں کھلے کیا آج میری زبان بند رکھو گے۔ کوئی ایسا احساس ہے کہ تم نہیں جانتے محمد بن جو تمہیں موت کے بعد پریشان کرے“

”آج تو سب کچھ بتا دوں گا جیلر صاحب۔ کیا آپ مجھے کچھ وقت دیں گے؟“

”میں تمہارے ساتھ پوری رات گزارنے کے لئے تیار ہوں محمد بن اپنے دل کا ہر راز کھول دو، جیلر نے کہا۔

”ہاں جیلر صاحب دل تو ہی چاہ رہا ہے کہ کوئی دل کی بات سُن لے جسے ہی شریف آدمی ہے آپ میرے ساتھ جیلر میں جو کچھ کہتا ہے میں آپ کو اس کے صلے میں صرف یہ وعادے سننا ہوں کہ خدا نہیں دینا کہ ہر بلا سے محفوظ رکھے، محمد بن کے ہنسنے میں کوٹ کوٹ کر غصوں بھرا ہوا تھا۔

جیلر کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ اس نے خود بخود بولنا شروع کیا۔ ہاں محمد بن کہو اللہ کی غصوں سے کہ جس سے تم نے یہ بات کہی ہے میں تمہارے ہم آنا چاہتا ہوں جیسے دوست زندگی بچانا اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آواز دی دے دیتا“

”میں جانتا ہوں جیلر صاحب لیکن بعض اوقات دو مجھے دل زدگی سے بڑھ کر سمجھنے میں جیلر صاحب مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے اس دنیا میں میری ایک بہن ہے میں انسان کی پریشانیوں اور الجھنوں سے واقف ہوں جیلر صاحب۔ میری بہن میرے ایک عزیز کے گھر پر ہے پچھلی بلدیہ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے اس کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ وہ خود بھی بال بچہ کا آدمی ہے اور اپنے ہی مسائل میں گرفتار ہے۔ سناں حالات میں جیلر صاحب جیلا وہ میری بہن کو کب خوش رکھ سکتا ہے میری بہن ایک لوگوں کے ماتمذ اس کے گھر کا کام کاج کرتی ہے اور شکل تمام ایسے دو وقت کی رہتی تھیں ہوتی ہے لیکن میرا عرصہ بڑی بہن سے تنگ آیا ہوا ہے جیلر صاحب خدا کی قسم زندگی میں پہلی بار دل چاہتا تھا کہ جیلر کو زکریا ہاں سے فرار کرنے کی کو شمشیر کر دوں اور وہ شرمیلی بہن کی درجہ سے۔ تب میں نے اپنے خدا سے کہا کہ میں تو پہلے بھی بے گناہ تھا اس بات کو خدا جانتا ہے تو پھر وہ میری مدد کیوں نہیں کرتا اور جیلر صاحب میں نے بالآخر اسے خدا کے چکر کر دیا لیکن سکون نہیں ملا میں جانتا ہوں کہ میرا وہ غریب رشتہ دار کبھی بے نصیب نہیں ہے۔ یہ بارہ اپنے ہی مسائل کا شکار ہے میری بہن کی کیا کفالت کرے گا وہ ساری زندگی ایسی طرح بیٹھی رہے گی جیلر صاحب لیکن شریف انسان ہونے کے نلٹے سے دل کی بات آپ سے کہہ رہا ہوں اور ضروری نہیں جیلر صاحب کہ آپ میری باتوں کو کسی ہوشمند انسان کی جیلا

سمجھیں کہ کوکھ اس دو میں ہر انسان کی اپنی جھیلیاں ہوتی ہیں لیکن آپ نے مجھ سے کہا ہے کہ میں دل آپ کے سامنے کھول دوں تو کھول ہا ہوں جیلر صاحب میری آخری خواہش یہ ہے کہ کوئی صاحب دل میری بہن کے سو رہا تھر رکھے اور اسے کسی ایسے تنگ انسان سے بیاہ دے جائے جو وقت کی روپیاں ہتیا کر دے اور اسے عزت کا مقام دے سکے اگر میری لاوارث بہن بیٹھ گئی جیلر صاحب تو میری روح سکون نہ پائے گی۔

”کوکھ اوہ محمد بن میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا لیکن میرے دوست اپنی بہن کو لاوارث نہ کرے گا۔ مجھ نے اس کے بارے میں تفصیلات بتاؤں میں کچھ زیادہ نہیں کر سکتا لیکن انشاہدہ کر سکتا ہوں کہ وہ اپنے پاس لا کر اس کی زندگی کے لئے کوئی مناسب ٹھکانہ تلاش کر سکتا ہوں۔ محمد خان صبح تمہیں موت کی سزا سنائے گی۔ خدا بزرگ و بزرگے پاس جلتے والے کے ساتھ میں کوئی یزید گفتگو نہیں کر رہا میں وعدہ کرتا ہوں محمد بن کہ تمہاری بہن تمہارے بعد میری بہن ہوگی اور میں اس کی بہن کی بہن کی لئے جو کچھ کر سکوں گا وہ کر دیا محمد بن نے گردن جھکا کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ پھر اس نے غلو گوئیے میں کہا یہ اگر یہ بات آج سے ایک سال پہلے کہی کوئی شخص کہتا تو جیلر صاحب ہاں کی قسم تم نے دن و رات کا انتظار کر دیا کرتا یہ اس بات کے کہنے کے بعد تو مجھے ایسی رقت بھانسی مل جاتی تو کہے پرواہ تھی جیلر صاحب آپ جتنے اچھے انسان ہیں اس کی وجہ سے میں آپ کی بات پر یوں پڑا ہوں کہ وہ کہہ رہا ہوں۔ خدا کی قسم آپ کے جاننے کے بعد میں پورا وقت سبک دے دیتا ہوں کہ اللہ کی قسم میں جیسے مرد کا وہ بوجھ ہٹا کر دے ہاں جو شاید مرث کے بعد بھی ہٹا نہ پڑتا“

”وہ ٹھیک ہے محمد بن کچھ سوچ کر رکھو“

”میں معلوم انسان ہوں جیلر صاحب بڑی مشکل کا شکار ہو گیا ہوں چھوٹا سا علاوہ تھا اپنی زندگی میں جیسے آدمی ہر باب بیٹھے دونوں نمنا اور وہی کہہ کہ اپنی زندگیوں کو سرسبز بنا دیا کہہ سکتا ہوں پھر لوگ یہ جھوٹی شہادتیں دیتے ہیں کہ ہم لوگ سکون کا سال گزارتے لیکن زمینوں کے اس مینڈر قطبہ پر جسے زمیندار کی نگاہ میں بیٹھیں انھوں نے ہر ممکن کو شمشیر کی کہ ہم زمینوں کے اس قطعہ کو خریدیں لیکن بھینا گھرا ہوا لدا کھڑی کوئی بیٹھتا ہے پھر زمیندار صاحب نے سازشیں کیں۔ ہر طرح سے ہمیں تنگ کرنے کی کو شمشیر کی آپ خود ہی بتا دیتے جیلر صاحب اتنی بڑی جاگیر کے مالک اگر زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے سے لگا ہوں چڑھائیے تو ان کی شان میں کونسی کمی واقع ہو جاتی۔ سکون سے بیٹھ دلوں کے سکون کو چھیننا کمال کی شرافت ہے۔ زمیندار صاحب اس طرح وعدے کر دے کہ تو انساہتہ ان کی کردہ سازشوں سے نفرت کرنے لگی اور جب وہ ان سازشوں میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے تو انہوں نے ایک آخری سازش کی۔ میں اور میرا باپ کبیتوں میں کام کر رہے تھے کہ بارہا دیوں نے ہم پر حملہ کیا پھر پرتو کا لہر پانے کے لیکن میرے باپ کو ٹھکر کر دیا گیا جیلر صاحب موت کی سزا

جیلر ہوں اس لئے جو تھوڑے سے کیا فائدہ جو کچھ کہا ہے کہ ہاں ہاں ہاں بھاگ گئے۔ میں زخمی ہو گیا تھا تب میں اپنے باپ کی لاش نے کشتی میں کیا اور میں نے سبکی ڈالوں کے سامنے زمیندار کا یہاں نہ رکھ دیا لیکن کئی کی جیلر کئی کو ظلم ہاں ساتھ دیکھا اس کی لاش بھی ایسی طرح کشتی میں آئی جس نے اپنے باپ کو تھکر کر دیا جیلر صاحب لیکن اس کی بڑی سچی تم کھائی بہت جلد زمیندار کو ایسی طرح فک و فخل میں پڑا ہوں کہ اتنا سمجھ جتا جیلر صاحب جرم نے خود نہیں کیا ہاں اس قسم کو پورا کر دیا اور زمیندار جیلر کی کھڑکی اس کی گردن سے تھکر کر لوری کشتی میں گھمٹنے کے بعد میں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا بس اتنا نہیں سمجھا تھا کہ کشتی کو کئی شخص میری بہن کا ساتھ نہیں دے گا یہی ایک غلطی تھی جیلر صاحب نے اپنی زندگی میں کیا رکھا تھا بعد میں یہ بتا کر میری بہن کشتی سے نکال دی گئی ہے کہ زمیندار کے دلوں میں میں نے اپنے باپ کے خاں کا انتقام لینے کے لئے اس کی بار بار ہاتھ ڈالا تھا۔ کشتی والے صرف اتنا ہی کر کے کہ انہوں نے میری بہن کو کشتی سے شہر بھاگا دیا اور اس وقت سے وہ میرے کس رشتہ دار کے پاس ہے زمیندار کے جھولنے کو شمشیر کر کے مجھے بھانسی کے تختے تک پہنچا دیا ظاہر ہے انہیں یہی کرنا چاہیے تھا لیکن جیلر بتائیں اگر وہ ہمیں اس چھوٹی سی زمین پر پڑنا دے گا تو ہمیں کینے دیتے تو ان کا کیا جانا بس اتنی ہی کہانی ہے جیلر صاحب محمد بن کی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے لیکن آپ نے جو کچھ کہا اس وقت تک اس کی قسم اگر زمیندار کا بڑا بچکانہ کا موقع ملا تو زمیندار کو لگا دے گا۔ محمد بن خاموش ہو گیا جیلر کی آنکھیں بدستور نم تھیں پھر اس نے گردن ہٹانے سے کہا کہ خدا تمہیں عذاب جنت سے محمد بن بہر صورت اپنی بہن کی جانب سے ملے رہا محمد بن صبح کو مرے گا لیکن اس کی بہن کا بھائی زندہ ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ محمد بن نے گردن جھکا کر کئی تھوڑی دیر کے بعد جیلر وہاں سے چلا آیا۔

لیکن اس کا وہ سن محمد بن میں اُلجھا ہوا تھا۔ اپنی رہائش گاہ میں داخل ہوا تو اس کی بیوی اس کی خاطر تھی۔

”خیریت۔ تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟“

”اوہ۔ تم کیوں جاگ نہیں؟“

”وہ بس آنکھ کھل گئی تھی۔ کہاں گئے تھے؟“

”کال کوٹھری کی جانب؟“

”کیوں؟“

”کل صبح محمد بن کو بھانسی ہو رہی ہے“

”ہاں۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا۔ مجھے کبھی دکھ ہوا تھا۔ بڑا اچھا انسان ہے یہ چارہ“

”ہاں کوتر۔ کبھی ہمارے معاشرے کے لئے نعت اصلاح کی ضرورت ہے۔ حالات بعض اوقات اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ اس ملازمت سے کوفت ہونے لگتی ہے سوجاؤ۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتی جیلر صاحب میری



دیکھ کر جو دل پہلے کہہ لو مقصد تو ہر حال میں بولا اور پہلے ہے  
شیرخان نے کہا اور فضل خان گہری گہری سانسیں لینے لگا اور بھولا۔  
"ابھی ابھی وہ یوتوف آئے تھے۔"  
"کیا مطلب ہے؟"  
"کسی انجن فلاح وہ بہرہ سے آئے تھے ہمارے متح فغانے کے  
فدہ مہیا کرنا چاہتے تھے۔"  
"انہ اچھا پھر تم نے کیا کہا؟"  
"دیکھا دیا بلکہ خود ہی بھاگ گئے۔ ظاہر ہے یہاں کے ماحول میں  
کون ایک سکتا ہے؟ فضل خان ہنستا ہوا بولا اور شیرخان کو ہنسنے لگا۔  
"تھوڑی دیر تک وہ مطلق انجن فلاح وہ بہرہ سے آئے ماحول کے بارے  
میں بات کرتے رہے پھر شیرخان چونک کر بولا: "جس نے تم سے ایک کلام  
کہا تھا فضل خان؟"  
"ہاں ہاں میں نے اسے انجام دیدیا ہے۔" فضل خان نے  
جواب دیا۔  
"کیا مطلب ہے؟"  
"معلومات کرل ہے تم محمد خان ہی کے بارے میں کہہ رہے ہو؟"  
فضل خان بولا۔  
"کیا معلوم کیا تم نے۔" شیرخان نے پوچھا۔  
"وہ ہمارے مطلب کا آدمی ہے۔"  
"کیا مطلب ہے؟"  
"مطلب یہ کہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے بچانسی پوچھنے۔"  
"ادہ۔ تفصیلات کیا ہیں؟"  
"تفصیلات یہ ہیں شیرخان کہ وہ نیک زمین کا بیٹا ہے ایک چھوٹے  
سے علاقہ کا مالک لیکن اس علاقے کے کچھ خالصے پر ایک جڑے شیلڈ نے  
اس کی زمینوں پر قبضہ کر کے لئے اس کے باپ کو قتل کر دیا۔ اور اس  
کے نتیجے میں اس نے اس جڑے زمین کو قتل کر دیا۔ ظاہر ہے جڑے  
زمین کا قتل زیادہ اہمیت رکھتا تھا چنانچہ اس کے نتیجے میں محمد خان کو  
گرفتار کر دیا گیا۔ کیس چلا اور اسے بچانسی کی نزا دیدی گئی ہے۔  
"محمد خان کا قرب و جوار کیا ہے؟" شیرخان نے پوچھا۔  
"وہ ایک ہن ہے جس کے بلے میں مجمع معلومات نہیں ہیں کلاہ  
جہاں ہے باقی اور کسی کا بہتہ نہیں چیتا۔"  
"تو پھر کیا خیال ہے فضل خان؟"  
"میں نے کہا ان محمد خان ہمارے معیار پر بولا اترتا ہے۔ وہ کوئی  
عادی مجرم تو نہیں ہے لیکن قتل کر چکا ہے۔ میرے خیال میں اسے  
بچانسی کی سزا نہیں ہونی چاہیے۔"  
"ہاں۔" شیرخان پر خیال اعلان میں بولا۔ "بچانسی کی سزا  
ہے فضل خان؟"

"پرسوں صبح سات بجے۔"  
"دیکھا کرتے ہمارے سلسلے میں۔" شیرخان نے پوچھا۔  
"جو شیرخان کے۔"  
"دل کے ہوئے؟"  
"کیوں نہیں؟" فضل خان نے جواب دیا۔  
"دیکھیں فضل خان محمد خان کیونکہ عادی مجرم نہیں ہوں۔"  
"ہم اس کی زندگی بچانے کے بعد اس کی کیا اصلاح کریں گے دوسری بات  
یہ کہ اگر بے جیل سے فرار کر لیا گیا تو ایک اور مشکل پیش آئے گی۔"  
"وہ کیا ہے؟" فضل خان نے پوچھا۔  
"ظاہر ہے پولیس اس کے پیچھے ہوگی اور محمد خان اپنی زندگی  
زندگی نہیں گزار سکے گا اسے جرموں کی ایک طرح پر شہید رہنا پڑے گا۔"  
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" شیرخان ویسے بھی محمد خان کا وہ  
لوچہ تم ہو جائے گا اسے چاہیے کسی دوسرے لٹیپ میں اب زندگی  
بسر کرے۔"  
"لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"  
"وہ کیا ہے؟"  
"پولیس کی نگاہوں میں بظاہر محمد خان کو بچانسی ہو جانی  
چاہیے۔"  
"وہ میں نہیں سمجھا۔" فضل خان تیرا نے بچے میں بولا۔  
"مطلب یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ بعد میں پولیس محمد خان کو  
پریشان کرتی پھرے وہ جیل سے فرار ہوگا تو پولیس کو اس کی تلاش  
رہے گی اور محمد خان بھی ہمیشہ سوچنا رہے گا کہ وہ ایک اچھے شہری  
کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔"  
"تو پھر اس سلسلے میں کیا کر سکتے؟" فضل خان نے پوچھا۔  
"کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا فضل خان تم ایک کام اور کر سکتے ہو۔"  
"ہاں ہاں بھائی پو پو فضل خان ہر ایک نام کے سنگار اس نام فغانے  
کا متعلق بننے کے بعد تو فضل خان کا ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے اس  
نے ساری زندگی کسی نہ کسی پتھر خانے یا پانچ خانے میں گزاری ہو۔"  
"کام یہ ہے فضل خان کہ تم صرف یہ معلوم کرو کہ بچانسی کے  
وقت کون کون اس بلکہ موجود ہوگا مجھے ارن کوئل کی ایک ہنرست  
چاہیے۔"  
"محل بھلے گل؟" فضل خان نے جواب دیا۔ "ان ہنرست  
کر شیرخان کی صورت دیکھ کر بولا۔ لیکن کر دئے کیا ہے؟"  
"انہی میں سے کسی آدمی کا انتخاب۔" شیرخان نے جواب دیا۔  
"اس سے کیا ہوگا؟"  
"وہ بھی میں اس بلکہ موجود رہنا چاہتا ہوں جہاں بچانسی  
دی جلتے۔"

"وہ سمجھا، فضل خان بولا اور پھر عجیب سی نگاہوں سے  
شیرخان کو دیکھنے لگا پھر اس نے نذر سے گردن جھکی اور گہری گہری  
سانس لینے لگا۔  
"دیکھیں کیا بات ہے فضل خان؟"  
"کچھ نہیں بار میں اس وقت کے بارے میں سوچ رہا ہوں  
جیل میں ایک سیدھا سا آدمی کشتی میں کھڑا تھا میں نے اسے  
دیکھا اور اس پر رحم کر لیا اسے اپنے پاس بلا لیا لیکن بعد میں وہ آدمی  
سینکلا شیرخان اگر میں یہ کہوں کہ اس ملک پر نہ اسی اس شہر پر مسل  
حکومت تہا رہی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔"  
"ابھی نہیں فضل خان۔ ابھی سے اتنی جری بات مت کرو۔  
ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" شیرخان ہنس کر بولا۔  
"جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ کم نہیں ہے شیرخان؟" فضل خان  
کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔  
"مجت ہے تمہاری۔ بس اب جاؤ اور میرا کام کرو۔" شیرخان  
نے کہا اور فضل خان باہر نکل گیا۔  
محمد خان کی نگاہوں میں کمال کوٹھری سے بہت دور سا خشک دیوار  
کے ایک روشندان کو دیکھ رہی تھیں، سورج، زندگی اور چہا ہی بلینا  
ہنڈلے، لیکن کسی چیز پر غور نہ نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا ناپا پیدا ہے اور  
اس دنیا کی کسی چیز پر غور نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ہر چیز کا تعین کرتے ہیں  
لیکن یوں لگتا ہے جیسے کسی بھی ایک چیز کا رخ نہ ہو۔ سورج کی پہلی کرن  
جہاں استغلوں اور روشنی کی پیاسہ ہوتی ہے وہیں وہ موت کی پیاسہ  
ماتی ہے۔ محمد خان جیسے آدمی کے لئے سورج کی پہلی کرن موت کی پیاسہ  
ہی ہونے والی تھی اور کمال کوٹھری کی دیوار کے اس جانب تارک رکھنا  
دان سے وہ سورج کی کرلوں کی آنکھ انتظار کر رہا تھا کہ کوئی جہاں  
کے لئے موت کی کرنیں ہی ثابت ہوں گی سورج کی ان کرلوں کے ساتھ  
اس کی زندگی ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گی۔ یہ اس کی سانسوں کا  
ہوگا۔ یہ چند سانسیں آخری سانسیں ہیں۔ آخری سانسیں۔  
لیکن اب اس کے ذہن میں کئی تڑپ نہیں تھا۔ ہزار ہا سوال  
کے ذہن میں آ رہے تھے۔ موت کا ایک دن معین ہے لیکن اس دن  
کے بارے میں کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا۔ نظر یہ بھی جوٹ ثابت  
ہو رہا ہے۔ ہاں شعروں کی یہ سورج یہاں آکر مٹ جھولی ہو جاتی ہے  
کیا ان کی نگاہوں میں زندگی کے اس رخ کو نہیں دیکھ سکتی تھیں۔  
محمد خان کو علم تھا کہ اس کی موت عجیب سات بجے آج کے گی  
اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ کسی عجیب بات ہے کہ وہ اپنی موت سے واقف  
ہے نہ صرف وہ بلکہ بے شمار لوگ جانتے ہیں کہ وہ سات بجے اس دنیا  
کیاں ہوگا۔ اسی کا فرق پڑتا ہے ایک دن تو یہاں سے جا رہی  
تھا اس نیک دل جیلز نے البتہ اس پر جانکشی کا عالم طاری نہیں ہوا۔

دیا تھا اگر موت سے کوئی خوف تھا تو موت بیکار کے بعد اس کی ہن  
لاوارث ہو کر رہ جائے گی وہ جیل ہی میں تھا لیکن زندہ تھا لوگ یہ  
کہہ سکتے تھے کہ اس ہن کا ایک بھائی بھی ہے اور ہنوں کے لئے جیل  
کا نام ہی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔ محمد خان یہی سوچ رہا تھا کہ اس کی  
موت کے بعد اس کی ہن کا بھروسہ ختم ہو جائے گا لیکن جیل نے اس  
کے ذہن سے یہ عجلت مٹا دی تھی۔ نیک دل انسان کی آواز اس کے  
خلوص ہاں تعین دلتی ہے جیلز نے اس سے کہا تھا کہ اس کے بعد  
محمد خان اس کی اپنی ذات میں زندہ رہے گا۔ اور کم از کم اس کی ہن  
کو کوئی تکلیف نہیں ہونے پائے گی اور ہاں اس محمد خان کے ہنوں  
پر مسکراہٹ بن جاتا تھا اور اب وہ موت کی جانب سے اتنا غرور مند  
نہیں تھا سورج کی پہلی کرن دیوار کے تارک غار کو روشن کرنے لگی اور  
محمد خان نے آنکھیں بند کر لیں اس کے ذہن میں عجیب سی آواز بچے  
گونج رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ اب اس کا ہر قدم موت کی جانب  
بڑھے گا اور جب کال کوٹھری کا دروازہ کھلا تو محمد خان کے دل کی جھڑپ  
اور تیز ہو گئیں کچھ بھی تھا موت کی جانب بڑھنے والا احساس بڑھ گیا  
ہوتا ہے۔ اسے جانے والے نہ جانے کیا کیا لگتا تھا کہ وہ تھے محمد خان  
کے کالوں میں وہی عجیب و غریب آوازیں گونج رہی تھیں اور اسے ان لوگوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں پھر  
جب اسے اس جگہ سے بھائی گیا جہاں بچانسی کا پھندا نظر آ رہا تھا تب  
بھی محمد خان نے اپنی اپنی نگاہوں سے اس ماحول کو دیکھا ہاں  
جب اس کے ہاتھ اڑیکس کیے گئے اور پاؤں نیچے باندھ دیے گئے  
تو وہ خیالات سے چونکا۔ کئی اس سے کہہ رہا تھا۔ محمد خان کلمہ پڑھو  
اور اس نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا سات بجے میں صرف تین منٹ باقی  
رہ گئے تھے۔ جیل ڈاکٹر اور وہ شخص جسے بچانسی نکلنے کا فرض انجام دینا  
تھا سامنے ہی موجود تھے۔ یہ سب کے سب اسے موت کے راستے پر لائے  
تھے اور اب ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔  
"تمہارے ذہن میں کئی خواہش ہے محمد خان؟" کسی نے سوال  
کیا لیکن اس سوال شخص کے ذہن میں کئی تحریک نہیں سیکل وہ  
سبٹ نکال ہوں سے اس پر سے ماحول کو دیکھ رہا تھا اور اس کے سینے سے  
صرف ایک ہی آواز نکل رہی تھی۔  
محمد خان یہ آواز بلند کلمہ پڑھنا رہا۔ اس کی آنکھیں زندہ رہنے  
والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ تب ایک جیل کا ڈاکٹر آگے بڑھا اور اس نے  
محمد خان کا جائزہ لیا۔ پھر وہ جلا دی طرف رخ کر کے بولا۔  
"تم اسے بچانسی دے چکے ہو؟" اس نے کہا۔  
"جلا دئے جو کہ کڑا لٹری کی جانب دیکھا اور جلا دیوں کی آنکھوں  
کی روشنی ماند پڑ گئی۔ پھر وہ مشین آواز میں بولا۔

”ہاں۔ میں اسے پھانسی دے چکا ہوں۔“  
 ”تب ان کا غلظت بردستھ کر دوڑا ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ میں پکھا  
 ہوا ناکل کھولا اور ایک دلیق ملاؤ کے سامنے کر دیا۔“  
 ”میں انکو ٹھانکاؤں کا جناب۔“  
 ”اے۔ اچھا میں انکو ٹھانکاؤں کا دو۔ ڈاکٹر بولا۔ اور اسی وقت جیلر  
 جھڑپ آگے بڑھتے۔“

”آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ ابھی تو یہ“  
 ”ہاں۔ آپ لوگ دیکھ لیں پھانسی تو پڑ چکی ہے۔ ڈاکٹر نے ہلکی  
 باری ان لوگوں کی آنکھوں میں دیکھا۔ دونوں غیب سے ڈاکٹر کو دیکھنے  
 لگے لیکن دوسرے نے ان کے ذہن میں بھی کھنسنے لگے۔ کئی قوت ان کے  
 ذہن پر حاوی ہوتی جا رہی تھی یہ کیا خیال ہے جیلر صاحب، پھانسی  
 ہو گئی ہے؟“

”ہاں۔ پھانسی ہو چکی ہے، جیلر کی بھرائی ہوئی آواز گونجی  
 ”آپ کیا کہتے ہیں جب یہ اس نے جھڑپ کی جانب دیکھا۔“  
 ”پھانسی ہو چکی ہے۔“  
 ”بلکہ تم تصدیق کر دوں ڈاکٹر نے محمد خان کا فائل پہلے جیلر کی  
 طرف بھاویا اور جیلر نے دستخط کر دیے۔ اس کے بعد جھڑپ ٹٹنے۔  
 ”اس لاوارث لاش کے لئے کیا بندوبست ہے جیلر صاحب؟“  
 ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

”اس کے گھنڈوں کی ذمہ داری میں نے خود ہی ہے کیونکہ شخص  
 میرے گھر کام کر چکا ہے مجھ سے اگت تھی۔“  
 ”خوب۔ آپ اچھا انسان ہیں، لیکن اتفاق سے اس کا ایک  
 عزیز کام کرنے کا خواہشمند ہے۔ باہر سیاہ رنگ کی ایک دین کھلی ہے  
 آپ اس کی لاش اس دین میں رکھو اور اپنے آدھوں کو بلا لائیں۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ جیلر نے کہا اور باہر نکل گیا۔  
 بے چارہ محمد خان بھی کبھی کبھی انکھوں سے یہ قدر دیکھ رہا تھا  
 سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔“

وہ زندہ سلامت کھڑا ہوا تھا اور وہ لوگ اس کی موت کی تصدیق  
 کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کا یہ انداز اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا۔ وہ  
 اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔  
 ”کیا خیال ہے محمد خان کیا نام ہے؟“ ڈاکٹر نے اس سے سوال  
 کیا لیکن محمد خان عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے  
 منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔

”میرا خیال ہے محمد خان تم کوٹھی دیر کے لئے مر رہی جاؤ تاکہ یہ  
 لوگ تمہاری لاش کھا کر کہاں سے لے جائیں؟“  
 ”آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔“ محمد خان  
 پریشان لہجے میں بولا۔

”اوپر سناؤ یہ نہیں اپنی موت کا یقین نہیں آ رہا ہے میری طرف  
 دیکھو میری آنکھوں میں دیکھا ہے کیا تم مر چکے ہو، محمد خان نے  
 ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور غصا سے اپنے ذہن میں ایک پلاسٹک سرگوشی  
 دھڑکی ہوئی محسوس ہوئی اور بعد چند ساعت کے بعد اس کی آواز آہستہ  
 آہستہ اُبھری۔“

”ہاں تو مر چکا ہوں۔“  
 ”بس بس میں ہی جانتا تھا کہ تم غلطی دیکھنے لے جاؤ۔“  
 پہلے میں تمہارے ہاتھ پاؤں اور کھول دوں۔ ڈاکٹر نے کہا اور پھر جیلر  
 کی جانب دیکھ کر بولا۔ بلکہ یہ کام تم انجام دو۔ جیلر دوست ان لوگوں  
 کے ہاتھ پاؤں تو تم ہی کھنسنے ہو جو مر جانے ہیں۔ اس نے جلاؤ سے کہا  
 اور جلاؤ نے تعمیل حکم میں گردن جھکا دی۔ چند ساعت کے بعد اس نے  
 محمد خان کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے اور محمد خان آہستہ آہستہ زمین پر  
 پٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں بغیر پھر ڈاکٹر نے ایک کپڑے اس کے  
 بدن پر لٹا دیا اور ان لوگوں کی آنکھوں کو کھلنے لگا جو لاش کو کھانے  
 کے لئے آنے والے تھے۔ چاند لڑا رہتے جو سفید لباس پہنے ہوئے تھے اور  
 انہوں نے ایک اسٹریپر سنبالا ہوا ٹھکانا۔ پھر انہوں نے ٹری ٹرانسپورٹ  
 اسٹریپر بن کر رکھا اور محمد خان کی لاش کو اٹھا کر اس پر لٹا دیا۔ جیلر ان  
 کے ساتھ ہی ساتھ باہر نکل گیا۔ قاتل نے یہاں موجود تمام آدمیوں  
 کو دیکھا اور مسکراتا ہوا بولا۔ ”یہ فائل میں جیلر صاحب کو دیدوں گا مجھے  
 اجازت دیجئے۔“ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور ڈاکٹر باہر نکل گیا۔  
 جیلر کے غصوں اساتوں سے گزرتا ہوا وہ گھٹ تک آباگیت سے جوڑ  
 ہی فاصلے پر سیاہ رنگ کی دین کھڑی ہوئی تھی اور اس میں لاش رکھ  
 دی گئی تھی جیلر وہاں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے وہ فائل جیلر کے پاس  
 کہا۔ اس پر اس نے اپنے دستخط بھی کر دیے ہیں آپ۔ یہ فائل رکھیں۔“

”بہت بہتر۔“ جیلر نے جواب دیا اور فائل لے کر واپس بیٹ آیا۔  
 سیاہ دین اب بھی کھڑی ہوئی تھی۔ جیلر کے اندر داخل ہونے کے بعد ڈاکٹر  
 نے اوپر اُٹھ کر دیکھا اور پھر اُسے ٹرہ کر سیاہ دین کے قریب پہنچ گیا۔ دوسرے  
 لے دین کے اگلے حصے کا دروازہ کھل گیا اور ڈاکٹر ڈاکٹر کے نزدیک بیٹ  
 گیا۔ ”جیلر انتہائی پھرتی کے ساتھ جیلر اس نے کہا اور دوسرے  
 آدمی نے کارڈ مارٹر کر کے آگے بڑھا دی۔ ڈاکٹر نے کئی بار پٹ کر دیکھا  
 تھا لیکن کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ کارڈ برقی رستاری سے اپنا سوز کڑی  
 تھی۔ کھڑی دیر بعد اُسے ڈاکٹر کی جانب دیکھا اور بولا۔ ”اب بیٹھ  
 آنا۔ محمد خان تمہاری شکل ٹری ٹھکانے لگ رہی ہے۔“

”اچھا تو یہ۔“ ڈاکٹر نے کہا اور پھر اس نے سنبلی گزرنے کے قریب  
 کوئی چیز چھٹی۔ دوسرے نے اس کے چہرے پر سے ایک جھلی سی آواز گئی  
 تھی اور پھر محمد خان کا اصل چہرہ فضل خان کے سامنے کھنڈ کھنڈی دیر  
 شہر خان اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ فضل خان نے ایک گہری سانس لی

اور بولا۔ ”تو تم سے ملنے کے۔“  
 ”ہاں فضل خان کہہ بتائیں میری لاش کی پرشرہ تھا یہ غیر خان  
 نے پوچھا۔“  
 ”اُسے نہیں با تیر۔ عداوت پر کرنے والا لاش کو برونڈ تو ہے  
 اور پھر کرنے کا مگر تو جس طرح حالت اپنے قبضے میں کر لیا ہے یہاں تک  
 میں آج تک نہیں آیا اور کبھی نہیں آئے گا۔“

”ہام ہو جاؤ ہے فضل خان صرف اس کے ملاؤ اور کیا پہلے  
 آخر تم لوگوں نے یہاں کا ٹھیکہ کیا ہے اس کے لئے تو کچھ نہ کچھ ہمارے پاس  
 ہونا چاہیے۔“  
 ”ہمارے پاس تو بہت کچھ ہے شہر خان فضل خان سوچ بھی  
 نہیں سکتا تھا کہ ایک دن وہ ایسے عجیب و غریب حالات سے گزرے  
 گا مگر ایک بات تو بتاؤ کیا جیلر میں سارے لوگ سو گئے تھے؟“  
 ”کیوں۔“ شہر خان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
 ”کسی نے تم سے یہ بات نہیں پوچھی کہ تم اسے کہاں لے جا رہے  
 ہو اور میرا خیال ہے جیلر اس طرح تمہارا تامل نظر آ رہا تھا جیسے تم اس کے  
 افسر ہو۔“

”ہاں بس وہ اپنا دوست بن گیا ہے۔“ شہر خان مسکراتا ہوا بولا۔  
 ”میں تو کھوڑا سا پریشان ہو گیا تھا جب وہ میرے پاس آیا کہ  
 کہیں وہ مجھے پریشان ہی نہ لے۔“  
 ”نہیں فضل خان ایسے میں آسانی سے نہیں پہچاننا ہوا سکتا  
 تمہارے اندر ٹری تبدیلیاں ہو گئی ہیں؟“  
 ”وہاں وہ تو میں بھی محسوس کرتا ہوں مگر یاد رکھو ٹری تمہیں  
 تو بتاؤ۔“

”کیا تفصیل پوچھنا چاہتے ہو فضل خان؟“  
 ”میرا مقصد یہ ہے کہ پھانسی دینے کی رسالت تو بوری کی ہی  
 گئی ہوں گی اور یہ پوچھ کر کیا ہی ہوتا ہے؟“  
 ”محمد خان کی بات کر رہے ہو۔“  
 ”ہاں۔“  
 ”وہ مر چکا ہے۔“  
 ”کیا مطلب، کیا فضل خان اچھل پڑا۔“  
 ”تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے آپ کو مر رہا ہی محسوس کر رہا ہے  
 اور جب تک ہم اسے زندہ رہنے کے لئے نہیں کہیں گے وہ نہیں ہوگا۔“  
 ”تم بہت عجیب ہو،“ فضل خان گردن جھٹکتا ہوا بولا پھر کہنے  
 لگا۔ ”بات وہیں آگئی میرا مطلب ہے جیلر کی رسالت، کیا اس کی  
 موت کی تصدیق ہو گئی۔“  
 ”ہاں فائل پر جھڑپ اچھا ڈاکٹر اور اس جلاؤ کے دستخط بھی  
 موجود ہیں جو اسے پھانسی دینے میں شریک تھے۔“

”محمد خان کے دستخط کہاں سے آگئے وہ تو اپنے گھر میں گہری لہجہ  
 سے کہے۔“ فضل خان نے کہا۔  
 ”گہری ہینڈ سٹائل سے پہلے اس کے دستخط اس فائل پر لکھے  
 گئے تھے۔“ شہر خان نے جواب دیا اور فضل خان گردن ہلانے لگا۔  
 ”حیرت باقی اپنی سمجھ میں نہیں آتی پھر سمجھنے کی ضرورت کبھی  
 کیلے۔ اپنا بار جو کچھ کر رہا ہے ٹھیک کر لے اور یہی کیا کہہ کر اس  
 شہر صاحب اپنی حکمرانی ہے۔ فضل خان نے کہتا ہے کہ اسے انداز میں  
 کہا اور محمد خان شہر خان ہلنے لگا۔“

محمد خان کی آنکھ کھل گئی، موت کے بعد کبھی کیلے ہی مناظر کا پو  
 کے سامنے ہوتے ہیں، اس نے سوچا۔ ”کہو خانا آرام نہ اور کر کے پتہ پتہ  
 سبھی موجود تھا یہ سب تو زندگی کے لوازمات ہیں اجنت اور دوزخ کا  
 تقصد تو کچھ اللہ ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر موت کے بعد کسی خود کو کھانا  
 پیر سکون محسوس کرے تو اس کا مقصد ہے کہ اس کا نام گناہگاروں میں  
 شامل نہیں تھا۔ یا پھر تو کھانا مال۔ بزنس لگا کر کھانا نیک انسانوں  
 کی قبروں کشان ہوتی ہیں اور انہیں کسی تکلیف کا احساس نہیں ہونا  
 محمد خان ان سلسلے احساسات میں غرق رہا۔ لیکن جب آہستہ آہستہ  
 اسے سلسلے واقعات یاد آئے تو وہ پریشان ہو گیا۔“

جیلر میں اسے پھانسی کے ختمے تکے پیدا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے  
 عجیب و غریب باتیں کی تھیں اور اس کے بعد اس سے سوچا۔ لوگ  
 تو بلاوجہ پھانسی سے ڈرتے ہیں یہ تو کوئی تکلیف دہ چیز نہیں ہوتی  
 آدمی بلاوجہ کسی تکلیف اور بغیر کسی احساس کے مر جاتا ہے پھر جب وہ  
 وہ شخص اس کی قبر میں داخل ہوا تو محمد خان چونک پڑا۔

یہ بظاہر تو فرشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ نام انسانوں کا ہے لیکن  
 پہنے ہوئے ہے اور عام سی شکل ہے جو عام طور سے دیکھنے میں آجاتی ہے  
 محمد خان بنو اور اس کی شکل دیکھتا رہا اور وہ شخص محمد خان کے بستر تک  
 پہنچ گیا۔ پھر وہ بندہ ہیچے میں بولا۔  
 ”کیا تم دوزخ میں آگے محمد خان۔“ اس شخص نے نرم لہجے میں  
 سوال کیا اور محمد خان چونک پڑا۔  
 ”ہوش کیا موت کے بعد کی زندگی میں کبھی ہوش و حواس کا  
 دخل ہوتا ہے؟“ اس نے سوال کیا۔  
 ”کیا مطلب، یہ وہ شخص چونک کر بولا۔  
 ”تم کون ہو بھائی؟“ محمد خان نے پوچھا۔  
 ”عبدالودود۔“ یہ نوجوان نے جواب دیا۔  
 ”فرشتے ہو۔“  
 ”کیا کہہ رہے ہو عبدالودود عجیب سے لہجے میں بولا۔  
 ”تو تم فرشتے نہیں ہو۔“  
 ”جی نہیں، فرشتے تو آپ ہیں، میں تو صرف یہ معلوم کرنے کے لئے

آپا تھا کہ تم جاگ کے سو رہا نہیں۔ لہذا جو ان والیس مڑتا ہوا لولا اور محمد خان  
لہجے سے آواز دی۔

”سنو تو اسی، سنو بھائی، براہ کرم ایک بات سن جا گا اور شخص  
رک گیا۔“

”میرے جنت ہے یا دوزخ یا محمد خان نے سوال کیا اور وہ جھلکے  
ہرے اعلیٰ میں محمد خان کی شکل دیکھنے لگا۔“

”میرا تمہارا مذاق کا کوئی رشتہ ہے؟ اس نے سیکھے لہجے میں پوچھا  
”تو تو یہ کہہا میں فرشتوں سے مذاق کر سکتا ہوں۔“ محمد خان  
نے جواب دیا۔

”اگر اب کہہ دو تم نے مجھے فرشتہ کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔ وہ شخص گونہ  
دکھا کر بولا اور محمد خان تیرے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ یہ کیسا فرشتہ تھا  
”تو تم فرشتے نہیں ہو؟“ محمد خان نے جبر سے پوچھا۔

”اے نہیں بھائی نہیں ہے عبداللہ وہ چلایا اور محمد خان کی سوجھ  
بوجھ سے وہ والا فرشتہ باہر نکل آیا۔ لیکن اس بار اللہ نے والوں کی تعداد کو  
اور یہ وہ نہیں تھے جو پہلے آئے تھے۔ ان میں ایک خوبصورت سا نوجوان  
آدمی تھا۔ دوسرا ایک قوی ٹیکل جڑواں شخص تھا۔ غالباً یہ ٹیکل جڑواں  
محمد خان نے سوچا اور پھر وہ یہ اندازہ کرنے لگا کہ ان میں سے کون ہے اور  
بیکر کن، وہ دونوں اس کے نزدیک پہنچ گئے۔“

”اٹھ جاؤ محمد خان۔ قوی ٹیکل شخص بولا اور محمد خان اٹھ کر بیٹھ  
گیا۔ اسے تیرے ملاپ سے بڑی دعتہ ہو رہی تھی اور اس کے چہرے  
پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔“

”دیکھا بات ہے محمد خان، پریشان کیوں ہو؟“ قوی ٹیکل جڑواں  
شخص نے سوال کیا۔

”میرا نامہ اعمال زیادہ اچھا نہیں ہے؟“ محمد خان مرہہ سے  
پس بولا۔

”دیکھا مطلب ہے؟“

”وہ میں قائل ہوں، میں نے ایک انسانی زندگی ختم کی ہے۔“  
”اے۔ لیکن اس وقت تمہیں اس اعتراف کی ضرورت کیوں پیش  
آئی؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”ہاں تم فرشتے ہو اب کچھ مہلتے ہو گئے لیکن ایک بات میری کچھ  
میں نہیں آتی کہ جب فرشتے سب کچھ جانتے ہیں تو حساب کتاب کیوں کیا جاتا  
ہے یا آنے والے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے اور پھر دعتہ قوی ٹیکل  
شخص کا ہتھوڑا گونج اٹھا۔“

”اے محمد خان تم ہمیں کیا سمجھ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھ کر۔“ محمد خان نے ایسے جواب دیا جیسے سے پہچان جانے  
پر بہت خوش ہو اور انہی فیات کا اظہار کرنا چاہتا ہو، لیکن قوی ٹیکل شخص



”بس محمد زمان ہم نے تمہاری جان بچانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں بڑے لوٹ اور سب غرض“

محمد زمان تب تک انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں غیب سے ہنر لاتے تھے۔ تب اس نے ٹھوکر ڈرا اور فرمایا۔

”دوستو! تم نے کہا کہ تمہاری کام نہیں کیا، میں نے تو اپنی نیکی نہیں کی۔ اس کی آنکھوں میں نئی آنکھی چند ساعت وہ ای طرح خاموش رہا پھر بولا: ”خدا میری مدد کرے گا، ہر گز یہ ہے۔ جلا لکھا یہ لوگ یقین کریں کہ مجھے اپنے دوستوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا فرض پورا ہو چکا ہے صرف بس کی بات تھی جو حیلہ اس کا ہمارا ابن گیا ہے“

”اوہ! تمہاری کوئی بہن بھی ہے؟“

”ہاں۔“

”مناسب سمجھو محمد زمان تو میں اپنی کہانی سناؤ“

”دو بڑی متحقر کہانی ہے“

”دوستو! اپنا ذکر دے“

”ہاں ضرور غلام کا شکار ہوں، بدلہ لیا تو موت کے پھندے تک پہنچ گیا، محمد زمان نے کہا اور پھر متحقر آواز سے اپنی وہی کہانی بدلا دیا جو حیلہ اس نے حیلہ کو سنائی تھی۔ دلوں میں نظر آ رہے تھے پھر تو حیلہ کی شکل شخص بولا۔“

”محمد زمان میرا نام فضل خان ہے اور پھر جہاں ہے ہم لوگ یوں سمجھ لو ایک طرح سے عدالتی فریاد ہے اور وہ کام کرنے ہیں جنہیں دوسرے نہیں کر پاتے ہم نے اپنی ایک عدالت ترتیب دی ہے اور اس عدالت میں ہم فیصلے کرتے ہیں۔ ہم دوسروں کے فیصلوں کو نہیں مانتے قانون نے ہمیں پھانسی کا حکم سنایا تھا لیکن ہماری عدالت نے ہمیں بری کر دیا اور بالآخر ہم نہیں وہاں سے نکال لئے تمہاری یہ کہانی ہماری عدالت میں پیش ہوگی اللہ آقا اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ تمہارے ساتھ آٹھ کبا سلوک ہونا چاہیے یا

محمد زمان تعجب خیز لگا ہوں سے ان دلوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا پھر وہ کہنے لگا: ”اگر آپ بڑا زماں تو ایک بت ہوں“

”ہاں ہاں ضرور“

”لیکن جناب! یہ یقین کریں میں اب بھی کچھ نہیں سمجھ سکا آپ کی عدالت آپ کی حکمرانی، اور آپ کون ہیں۔“

”بہل سمجھو ہم، زمینوں حکمران ہیں۔ زمین کے اور پھر فیصلے ہونے میں زمین کے شیخے ہم ان کا سمجھ کر کرتے ہیں اور جہاں پہلو پر یہ سمجھتے ہیں کہ کون فیصلہ درست ہے جہاں کہ محمد زمان ہم نے کہا اور کہو، تمہاری بہن کے بارے میں، ہمیں تفصیلات دیکھنا ہوں گی اگر تم چاہو گے تو ہم اسے کوشش کر کے تمہارے پاس پہنچا دیں گے۔ اور اگر تم نہیں چاہو

کہاں گرج، تو ہنر ٹری زندگی سے گونا گونا پھروں نے اپنے ساتھی محمد زمان کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”واہ بھائی نکیر، بانسکر۔ پارٹینیکل کر لو کہ ہم میں سے منکر کون ہے اور نیکر کون ہے“

”مذاق مت کرو فضل خان وہ جہاں خود کو مردہ سمجھ رہا ہے مجھے بہت دکھ ہے۔ دوسرے محمد زمان شخص نے کہا اور محمد زمان تعجب سے اٹھیں بڑا۔ اس شخص نے جو زبان تھا دوسرے کا نام فضل خان بولا تھا، اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ منکر نیکر نہیں ہیں۔ تب فضل خان اپنے منہ کو دو ہاتھ جمتھ کر کے دکھانا اور پھر اس نے بڑی بے چارگی سے پوچھا۔

”بھائی خود لکے نے مجھے اپنے ہاتھ میں بتا دیا میں تو قسمت پریشان ہوں“

”پہلے ایک بات بتاؤ محمد خان“

”پوچھو“

”کہا تم خود کو مردہ سمجھ رہے ہو“

”دوسری بات تم مجھے بتاؤ کہ میں زندہ ہوں“

”ہاں ظاہر ہے، کیا تمہیں گوسے ہو کے واقعات یاد نہیں ہیں۔ تمہیں پھانسی کے پھندے سے بچا لیا تھا۔“

”بچا لیا گیا تھا“ محمد خان حیرت سے سمجھ بولا۔

”ہاں۔“

”مگر کسی طرح۔“

”ان ساری باتوں کو چھوڑو۔ یہ تمہیں آہستہ آہستہ معلوم ہو جائیں گی۔ فی الوقت تم یہ بتاؤ کہ تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو، کیا تم ٹھیک ہو، یا کسی سلسلے میں پریشان“

”ہمیں بھائی، میں اب کسی سلسلے میں پریشان نہیں ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری پریشانی ایک ایسا حل نکال آیا ہے کہ اب تو مجھے

زندگی با موت سے کوئی خوف ہی نہیں ہے“

”کہا مطلب یہ“

”خدا! بس نیک دل حیلہ کو تاقیامت خوش رکھو اس نے میرے سینے سے منل ورتی بوجھا تھا پھر کہا“

”حیلہ کی بات کر رہے ہو، محمد زمان چونکہ کر بولا۔

”ہاں وہ حیلہ۔ میں اس کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا، محمد خان گہری سانس لے کر بولا۔

”کیسا احسان۔ ہمیں بھی کچھ تفصیل بتاؤ۔ محمد زمان نے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی، محمد خان جھٹک بڑا۔

”دو مگر دوستو تم کون، ہمارا وہاں میں پھانسی کے تھے سے ہاتھ

کیسے پہنچ گیا۔ یہ تو بڑی انوکھی بات ہے، شاید ہی اس سے قبل ایسا

کبھی ہوا ہو، براہ کرم مجھے اپنے ہاتھ میں تو بتاؤ۔“



میں وہاں تک جائے گا تو میرے پاس سے بھی نہیں پاسکتا۔  
ٹھیک ہے پھر اس کی ریکارڈ میں ساری تفصیلات موجود  
ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں پر لاشی کا شکار ہو جانے کا یہ نفل  
نے کہا۔

”میں نفل خان، تمہارے خیال میں شیر خاں ایسے ہی کہتے  
کا کہتا ہے۔ مگر خاں اپنی اصل حیثیت میں وہاں نہیں جاتے گا۔ ہم  
اسے مکمل طور پر تبدیل کر دے گا۔ مثلاً اس کا لہجہ ہی ساری ہونگی اور اس  
کا نام محمد خاں کے بجائے دن محمد کیسا رہے گا؟“  
”بڑا ہی اچھا نام ہے، رہی اس کی بہن تو بہ صورت ہمارے  
کی جی جی کے لئے تلاش کرے گی اور مجھے امید ہے کہ وہ کامیاب  
ہو جائے گی تو بعد میں اسے محمد خاں کے پاس پہنچا دیں گے۔“ شیر خاں  
نے جواب دیا۔  
”ٹھیک ہے شیر خاں! بیسیام پسند کرو نفل خان کو کیا ہوا  
ہو سکتا ہے۔“  
”میں نفل خان! اگر کوئی اور تجوز تمہارے ذہن میں ہو تو  
مجھے بتاؤ۔“

”بھائی تیرے معاملے میں تو اپنا ذہن ہی کام نہیں کرتا اور اپنی  
بے کوشش میں نہیں تاکہ یہ سارے لوگ تیری باتیں کیسے ان لیتے ہیں  
اور کیوں مان لیتے ہیں؟ نفل خان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا کہ  
شیر خاں ہنسے لگا۔

”بس! نفل خان ماشہ دیکھتے رہو جہاں کہیں محسوس کرو  
کہ مجھ سے غلطی ہو رہی ہے اور تمہیں مداخلت کی ضرورت ہے  
تو ہر وہ مداخلت کرنا۔ میں تمہاری بات بڑی خوشی سے سنوں گا۔“  
”ہر وہ ضرور! نفل خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ ہند  
کسی معاملے میں کوئی بات سمجھ میں آتے تو بڑی بات ہے۔ میں جب  
کسی چیز کو سمجھ ہی نہیں سکوں گا تو تمہیں شہرہ کیا دوں گا؟ نفل  
خان نے ہنستے ہوئے کہا۔

”حالانکہ سمجھنے کی کوئی بات نہیں ہے نفل خان! کوئی  
بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کیا تم اس پر بڑے نظام سے ناواقف ہو؟“  
”یسا ہی لگتا ہے میرے دوست شیر خاں! نفل خان تو  
ایک سیسے سا آدی تھا۔ غصہ آگیا تو مار پیٹ کر اپنے دشمن کو  
ٹھیک کر لیا۔ دل کی بھڑاس نکال لی۔ دولت کی ضرورت ہوتی تو  
کہیں سے بھی حاصل کر لی اور جب باہر سے دل بھر لیا تو جمل چلا گیا۔  
اور سب کچھ سب کچھ ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سب کچھ تیرا پھیلا  
ہو رہا ہے شیر خاں۔ اور تو.... تیرے بارے میں تو میں آج تک فیصلہ  
ہی نہیں کر سکا کہ تو زمین کار بنے والا بھی ہے یا نہیں؟ نفل خان نے  
گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ اور شیر خاں ہنسا ہنسا ہنسا ہنسا۔

”حالانکہ اس میں سمجھنے والی کوئی بات نہیں ہے نفل خان! میں  
کہہ چکا ہوں کہ اس حالات کے ہمتوں مجبور ہو کر مجرم بنا لیا گیا ہے  
نے اپنی اس مجرمانہ زندگی کو پسند نہیں کیا۔ میری خواہش تھی نفل خان  
کہ میرے علاوہ اس دنیا میں اور کوئی مجرم نہ ہو جو تم کے راستوں سے  
بہک کر اچھے راستوں کی طرف آئیں۔ میں تو مجرم ہی چکا ہوں۔ دوسرے  
نہ بچو گے اور اسی جذبہ کو لے کر میں نے میدان عمل میں قدم رکھا اور  
اسی جذبہ کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ چاہتا ہوں نفل خان کہ وہ  
لوگ جو لوگ کی زندگی کی جانب دھڑے دھڑے ہیں اور ان کو حالات نے  
خود کو نہ سمجھانے کا موقع نہیں دیا میرے ذریعہ صحیح راستہ پر آجائیں۔  
ان کی مجرمی ختم ہو جائے۔ اور وہ ایک مناسب زندگی حاصل  
کر لیں۔ زندگی جو ایک اچھے شہری کی زندگی کہلاتی ہے۔ مگر خاں  
ہی کو لے کر حالات نے اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچا دیا  
لیکن تم خود بتاؤ نفل خان کیا اس کا جرم ایسا تھا کہ اسے پھانسی دی  
جاتی۔ اس سے پہلے جو لوگ جرم کر چکے ہیں انہیں پھانسی کیوں نہیں  
دی گئی۔ صرف اس لئے تاکہ محمد خاں کی اولاد محمد دہی۔ وہ میری ہی  
مانند تھا میری ہی طرح تھا۔

شیر خاں کے چہرے پر ایک ٹکی سی تھما ہٹ پیدا ہو گئی اور  
نفل خان بغور اسے دیکھتا رہا۔ چند لمحے خاموشی سے گذر گئے نفل  
خان گہری نگاہوں سے شیر خاں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جب دونوں کی  
نگاہیں ملیں تو شیر خاں مسکرایا لیکن نفل خان کے چہرے پر سنجیدگی  
ہی رہی۔

”ایک بات ضرور کہوں گا شیر خاں! تو بڑا لہرا آدی ہے۔“  
”کیوں نفل خان! کیوں کہہ رہے ہو یہ بات؟“

”اس لئے کہ جب تو بچپن میں بارہ برس کے سامنے آیا تو ایک بھیکے ہوئے  
چوہے کی طرح تھا معصوم اور نازک نازک سا پھر جب رونے  
میری انگلیوں میں پھنسا کر مجھے شکست دی تو میں حیران رہ گیا لیکن  
اس کے باوجود میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ تو اندر سے ایسا عجیب غریب  
آدی نکلے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تو نے نفل خان کو ناکارہ کر دیا اور اب  
نفل خان سہما سہما کر رہی ہیں کہہ سکتا کہ وہ نفل خان ہے۔ وہ  
نفل خان کب جس کے طب سے اچھے اچھے لوگ کا نیتے تھے۔ آج  
صرف تو ہی تو ہے۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے شیر خاں  
لیکن ویسے ایک انفس ضرور ہے اور وہ وہاں تک سے ناواقف  
ہوں کہ تو اندر سے کیا ہے اور نفل خان کی طبیعتی نہیں تو اور کیا ہے  
کہ وہ اپنے دوست کی بھلی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا  
ابھی تو نے ذکر کرتے ہوئے یہ بات کہی تھی کہ مجھ مجرمانہ زندگی پسند  
نہیں تھی کسی خاص وجہ سے تو اس زندگی میں آیا کیا مجھے اتنا بھی  
حق نہیں ہے کہ میں تجھ سے تیرے بارے میں معلوم کر سکوں نفل خان!

بھاری لہجے میں بڑا اور شیر خان کے انداز میں سنجیدگی آجی چند منٹ  
وہ گردن جھکا کر سچا ہوا ہوا اس نے نفل خان کی طرف دیکھا تو اس  
کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔

”دوست ہو نفل خان تو ان چند گریوں کو دبا رہے دو۔ زہن  
کر کے نادر ستوں کا مہرہ نہیں ہوتا۔ میں نے اپنا ماضی بے لگاؤ سے  
پر سے دھو دھو کر گھس گھس کر اٹھائی اور نفل خان میں نہیں  
کہہ سکتا کہ اس آگ کو سر کرنے کے لئے مجھے کیا قدم اٹھانا پڑے  
میں نے ماضی کو اتنا لہرا دین کر دیا ہے کہ وہ شکل ہی سے بچھ  
سکتا ہے۔“

”بھوٹ بول رہا ہے شیر خاں! تو نے اپنا ماضی ذہن نہیں کیا  
تو آج بھی اپنے ماضی کو یاد کر کے دہی عمل کر رہا ہے جو تیرے ماضی  
کی بھلا ہے۔“

”خوف بیکار رہ گئی ہے نفل خان! اس بیکار رہیہ زندہ  
رکھنا چاہتا ہوں کچھ آوازیں میں نے اپنے کانوں کے لئے نفل خان  
کے لئے رہنے دی ہیں جو میری زندگی کو رولوں دوں رکھے ہوئے ہے  
اگر یہ آوازیں فنا ہو گئیں تو شیر خاں میں کچھ باقی نہیں رہ جاتا گا۔“

”ارے اور اس سفر تو لڑا لڑا نہیں ہے میں بہت بہارت رکھتا ہے  
اور نفل خان تم تو جوی آلو لیکر آکر کھٹے۔ ہمیشہ دوسروں کی باتوں  
میں آجاتے ہو۔ ٹھیک ہے بھائی ٹھیک ہے۔ منت بتاؤ اپنے  
بارے میں اور نفل خان دسدہ کر کے کہتا ہے کچھ کچھ نہیں  
پوچھے گا۔ چل پھوڑ۔ اب یہ بتا کر آگے کیا کرنا ہے نفل خان  
گہری گہری سانس لیتا رہا۔ وہ اپنے آپ کو معتدل کر رہا تھا پھر  
اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

”ناراض مت ہونا نفل خان! میں نے تم سے کہا تھا کہ میرا  
ماضی مجھے دکھ دیتا ہے۔ اس لئے میں اسے دفن ہی رہنے دینا چاہتا  
ہوں۔ میرے دوست کی حیثیت سے تم میری اس کیفیت کو برداشت  
کر لو گے۔ مجھے یقین ہے۔ باقی رہا آگے بڑھ کر کے کا سلسلہ میں اپنے  
پیارے دوست سے کوئی بات چھپانا پسند نہیں کروں گا نفل خان  
مگر خاں دین محمد کی حیثیت سے اس سب میں جائے گا اور جہاں دین  
سے اس کی ساری زمینیں اور جاہیلوں و سولوں کرے گا۔ میرا فیصلہ  
ہے بالکل اسی طرح جیسے میں نے اسے پھانسی کے پھندے سے  
اندکرائنے کا فیصلہ کیا تھا اور تم دیکھ لو کہ وہ آج تمہارے درمیان  
موجود ہے۔“

”ٹھیک ہے میں مطمئن ہوں! نفل خان نے کہا اور یہ گفتگو  
ختم ہو گئی۔ شیر خاں بغور اس ناکل کو دیکھا رہا تھا جو دین محمد کے بارے  
میں اسے یہاں کی تھی۔  
”ختم ہونے کے تحت ایسے بہت سے محکمے ترتیب دے

لئے گئے تھے۔ ان محکموں کے لئے ہم توڑ لگا اپنے کا مصلحیہ مشورے  
تھے۔ یہ محکمے جنہوں کے بارے میں تفصیل، ختم ہونے والے جوام  
کی رپورٹیں وغیرہ دیتا کرتے تھے اور اس زمین میں حکومت میں ان کام  
پر لڑنے کا ہاتھ لیا جاتا تھا۔

”یہی اعظم کو بھی مسزہ شاداب کیسٹوں کی کاپی تھی۔ یہاں کے  
رہنے والے اپنے زمیندار چاندین کے بارے میں جو کچھ بھی خیالات  
رکھتے ہیں لیکن اپنی جی سے پوری طرح متاثر تھے اور اس جی  
کو مریا کی دولت سے مالال کرتے ہی اپنا خن پسینہ ایک کرتا  
تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دیکھنے والے ایسی کی کھسوں اور اس کے لہلہانے سن  
سے سجدہ شکر ہوتے تھے۔

”پرانے طرز کی جیب اچھلی کی رون! ہمارا چوڑی پڑا کے بوجھ رہی  
تھی پستی اعظم کو بھی کی جانب جاتی تھی۔ سب کے تھوڑے ذرات  
ہوئی جیب کو بھی کڑواٹ کے طور پر تھوڑے ہو گئے۔ جیب ان کے قریب  
آ کر کھڑکی ہو گئی کے ہر تھوڑے کے لئے کئی کرنے والا شعا آئی کے  
بڑھا اور اس نے ڈانٹ کر تھوڑے کو جیب کے نزدیک سے ہٹا دیا جیب  
کے اندر میں انزل تھے۔ ایک درمیان بھوکا ڈھری والا ڈو۔ نفل خان کی  
اور ایک اور نفل خان سورت نفل خان تھا۔ یہیں انزل اس جی میں داخل ہو  
تھے۔ نفل خان ڈر آ کر ٹھیک سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہڑتے کو  
اشان سے نزدیک بلایا اور بڑھو حاس کے نزدیک پہنچ گیا۔

”زمیندار چاندین کا مکان کن سا ہے نفل خان نے پوچھا۔  
”جی، وہ جو جے سے پتا ہوا ہے۔ اونچا سا مکان، سب جی میں  
بھلا کسی اور کا ہو سکتا ہے۔ نفل خان نے جواب دیا اور نفل خان  
اس کے اشارے کی سمت دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بڑھو کا شکر  
اوکیا اور جیب آگے بڑھادی۔ کچھ دیر کے بعد جیب زمیندار  
کے مکان کے سامنے کی تھی۔ چند لوگ موجود تھے جو بعضی طور پر  
زمیندار کے ملازم تھے۔ سب کی نگاہیں جیب کی جانب اٹھ  
گئیں۔ نفل خان نے اترا۔ لڑکی اور ڈھری والا ڈو جیب کی جیب میں بیٹھے  
سب کھنکھتے۔ نفل خان نے یہاں بھی ایک شخص کو اشارے سے بلایا اور  
کہنے لگا۔

”ہم چاندین کے مہمان ہیں۔“  
”اور کہاں سے آئے ہو سرکار!۔۔۔ سرکار چاندین کو  
اطلاع دینا چاہئے۔ آپ اپنا نام پتہ بتاویں، اس شخص نے کہا۔  
”بس ان سے کہو کہ ان کے کچھ دوست شہر سے آئے ہیں  
اور ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔“  
”نام نہیں بتلاؤں گے سرکار!“  
”تم سے کچھ کہا ہے وہی کہو! نفل خان نے کہا اور وہ شخص  
جلدی سے اٹھ کر گیا۔

چراغ دین خود باہر نہیں آیا تھا بلکہ اس بار اس شخص کے ساتھ دو اور آدمی باہر تھے تھے اور انہوں نے غم سے ان لوگوں کو دکھا۔ پھر انہوں نے آپس میں کچھ گفتگو کی اور ان میں سے ایک اندر چلا گیا اور آدھی گھنٹہ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس نے زجران کو سلام کیا پھر پڑے اور بے پروا۔

”اندر تشریف لائیے جناب! زمیندار صاحب ابھی آتے ہیں آپ ان کا انتظار کریں۔“

”ٹھیک ہے جہاں گھڑی کا خیال رکھا جائے، زجران نے کہا پھر اس نے داری والے شخص اور اس لڑکی کو بھی آواز دی اور وہ دونوں بھی نیچے آئے تھے۔ پھر زجران کے بھائی نے اشارہ ڈال دیا کہ وہاں چھپے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ہی وہ شخص بیٹھ گیا تھا۔ جو انہیں یہاں تک لیکر آیا تھا۔ چند ساعت کے بعد زمیندار بھی اندر داخل ہو گیا۔ چہرے سے اور ایش نظر آئے۔ وہ والا اندر داخل ہو کر گہری ننگھڑوں سے ان لوگوں کا جائزہ لینے لگا اور پھر اسکی بھڑکی ننگا ہی لڑکی پر لڑ گیا۔ پھر ہنٹول پر ایک شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی پھر وہ پرتیاک انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”آپ کو نہیں پہچانتا، شاید کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن اس کے باوجود آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں تو میں خوش آمد دیکھتا ہوں۔“

”مگر یہ چراغ دین صاحب بڑی طرفین سے تمہیں آپ کی، سر جاکر آپ سے ملاقات ہی کر لی جائے۔“

”اور میرے۔۔۔ زمیندار بھونڈے کے انداز میں ہنسنے لگا۔ یہ کہیں قابل ہوں۔ اور آپ لوگ یہاں کیوں بیٹھ گئے۔ ارے کرو، مجھ سے یہاں کے لئے آرام دہ رہائش کا انتظام کرو۔“

”میرے زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹھہریں گے زمیندار صاحب رہائش کی کوئی ضرورت نہیں ہے گفتگو کرنے کے بعد وہاں سے چلے جائیں گے۔“

کا مقصد پوچھا جائے گا۔ ابھی میرے ملازم آپ کے لئے آرام کا بندوبست کئے دیتے ہیں۔ زمیندار نے کہا اور زجران نے گردن ہلا دی۔ پھر زجران کے بندوبست کے لئے ملازم واپس آگئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ وہاں کی رہائش کا بندوبست کر دیا ہے۔ لے جاؤ انہیں اور انہیں ان کی تمام گاہ میں بھٹاؤ و زجران کے لئے شام کا انداز میں کہا اور زمیندار فوراً اٹھ گئے۔

زمیندار کا مکان دیہات میں بنے ہوئے مکانوں کی نسبت کچھ جدید تھا۔ کمرے تو اس میں بیکار بنے ہوئے تھے لیکن ان کی ترتیب مناسب نہیں تھی۔ جن دو کمرے میں انہوں کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا وہ نزدیک نزدیک تھے۔ ملازم نے ایک کمرے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو ان کی بی بی کے لئے ہے دوسرے میں آپ دو فونو بیٹھے رکھیں۔“

”کیا یہ ضروری ہے کہ بی بی جی اسی کمرے میں رہیں۔ جرم نے بتایا ہے۔“

”جی ہاں یہ ضروری ہے۔ زمیندار صاحب کی اس عورت کے کچھ اصول ہیں اور ان اصولوں کو کوئی بھی توڑنا نہیں کرنا۔“

”خوب خوب کیا یہ اصول بہانوں پر بھی لازم ہوتے ہیں۔“

”جی ہاں جناب! اس علاقہ میں داخل ہونے کے بعد ہر شخص وہی کرتا ہے جو زمیندار کی مرضی ہوتی ہے۔“ ملازم نے کہا اور زجران نے گردن ہلا دی۔ پھر وہ واپس چلا گیا۔

کمرے ضروریات زندگی سے معمولی طور پر آراستہ تھے۔ یعنی یہاں کسی چیز کی تکلیف تو نہیں تھی لیکن ان میں کوئی چیز بھی نہیں تھا۔ بس ایک معمولی سی رہائش کا بندوبست تھا۔ بہر صورت آئے والوں کو ان کمروں کی سجاوٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ جانے ان کے یہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔ وہ مینوں ایک ہی کمرے میں داخل ہو گئے اور ایک نشست پر بیٹھ گئے۔ زجران کسی خیال میں نہ تھا۔ پھر وہی کمرے کے بعد اس نے گردن ہلائی اور اس شخص کی جانب دیکھا جس کی لمبی داڑھی تھی۔

”تمہارا نام اپنی زمین اور اپنی لہجہ میں آکر تمہیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟“

”میں اپنے جذبات بیان نہیں کر سکتا شیرخان! محمد زجران نے جواب دیا۔

”میں جانتا ہوں میں محسوس کرتا ہوں۔ بلاشبہ یہاں آکر تمہاری ذہنی کیفیت ابھی نہیں ہوگی۔ یادیں انسان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن محمد زجران اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے ہیں دنیا کے دوسرے لوگوں کی طرح چھلانگی اٹھنا پڑتی ہے۔ اگر ہم سادگی سے زندگی گزارنا پسند کریں تو دوسرے پہلی اس پسند کا خیال نہیں رکھتے ہیں۔ تمہیں جو ہدایات دی ہیں ان سے سراسر انحراف نہ ہو۔ اس میں بددی کا سیانی پر مشید ہے۔“

BY  
S  
A  
L  
I  
M  
K  
H  
A  
N

میں انتہائی کوشش کروں گا شیرخان! اور تم اطمینان رکھو میں تمہاری دیکھتی ہدایات پہنچانی طرح عمل کروں گا۔ لیکن کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”وہ کیا محمد زجران! شیرخان نے پوچھا۔“

”تم زمیندار چراغ دین سے مل لے۔ میرا خیال ہے اس کی شخصیت، اس کی ذہنیت کے بارے میں اندازہ لگانا زیادہ مشکل کام نہیں ہے تو ایسی حالت میں تم قانونی پہلوؤں کو نظر نگاہ رکھتے ہوئے اسے کس طرح مجبور کر لے کہ وہ میری زمینیں مجھے واپس دے دے۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو محمد زجران! کیا تم یہاں صرف اپنی زمینیں لینے آؤ ہو۔ شیرخان نے آنکھیں نکال کر سی تندہ صلیب انداز میں کہا۔ اور محمد زجران ہنسنے لگا۔

”مجھے قرآن کی امید بھی نہیں ہے شیرخان! تمہا ایک مخلص انسان ہو اور میں جانتا ہوں کہ تم پر بے غلوں سے یہ کوشش کرو گے کہ میرا مستقبل سنبھل جائے۔ لیکن زمیندار کو کس طرح مجبور کر دے یہ بات کسی طور میری سمجھ میں نہیں آتی۔“

”بات میرے غلوں کی نہیں ہے محمد زجران بلکہ عدالت کے اس فیصلہ کی ہے جو ہمارے حق میں دیا گیا ہے اور جس فیصلہ کے تحت میں یہاں آیا ہوں۔ میرا کام ہے کہ اب زمیندار کو بھکاریوں کی سی زندگی گزارنی ہوگی اور وہ سب کچھ جو اس کے قبضہ میں ہے سب ہمارے قبضہ میں آجائے گا اور آئے۔“

”الوقت ہمیں خود بتائے گا کہ یہ سب کچھ کیوں کر ہوا۔ شیرخان نے جواب دیا۔“

”مجھے بڑی حیرت ہو رہی ہے شیرخان! بہر حال تم کہہ رہے ہو اس لئے میں خاموش رہا جاتا ہوں۔“

”ہاں۔ لیکن اس لڑکی کو یہاں کیوں لائے ہو۔ مجھے سخت طیش آ رہی ہے۔“

”تو زمیندار نے کہا۔ شیرخان نے جواب دیا۔“

”اس کی نیب کیا ہے۔ زجران نے مسکراتے ہوئے کہا اور محمد زجران چونک کر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

”خوبصورت لڑکی کے ہونٹوں پر خوبصورت مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔“

”کیا نیب ہے زجران! کیا یہ بات تمہارے ذہن میں نہیں تھی۔“

شیرخان نے پوچھا۔

”مجھے تو لایا ہی اس لئے گیا ہے محمد زجران کہ ہم لوگ چراغ دین کی توجہ حاصل کر سکیں۔ آتی رہی چراغ دین کی ظالمت آئینہ سوچ کی بات نہ تو تم کیا سمجھتے ہو، میں اگر تمہا بھی ہوں تو میرے ہاتھ کی ایک ضرب اسکی گردن کی ہڈی توڑ سکتی ہے۔“ لڑکی نے کہا اور محمد زجران پھر خیالی انداز میں گردن ہلانے لگا۔

”تم لوگوں کے بارے میں نہ میں کچھ جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے۔“

”کچھ جان ہی نہیں سکوں گا۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تم کون ہو؟“

”عندانی فرخندہ! شیرخان ہنسنے لگا اور لاوا اور محمد زجران پھر علی علی مرکز ہو گیا۔ خاموش ہو گیا۔

”مقام کی حالت پر ملاحظہ ہو۔ کیا تھا۔ جانے کا اہتمام اسی جوتی کے ایک بڑے کمرے میں کیا گیا تھا جہاں چراغ دین نے اپنی دانست میں بہترین فرخندہ لایا تھا۔ ایک بیوی بزرگ پر تن بھیجے ہوئے تھے۔ ملازم انہیں بلانے کے لئے آئے اور وہ بیویوں کو مگرے میں بیٹھ گئے۔ چراغ دین وہیں موجود تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

”کڑے ہوئے کرتے اور سفید لاپچے میں چراغ دین کی شخصیت نمایاں ہو گئی تھی۔ بڑی بڑی منجھڑی کی چھانوں میں کھپلی ہوئی مسکراہٹ بڑی بڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں ہنس کے چراغ روشن تھے۔ مخاطب وہ ان لوگوں سے ہوا لیکن اس کی نگاہیں رخسانہ پر تھی ہوتی تھیں۔

”آئیے آئیے۔ آپ لوگوں کی آمد میرے لئے سورت کا باعث ہے اور آپ لوگ یقین کریں کہ میں نے یہ وقت بڑی شکل سے گزارا ہے میں سوچ رہا تھا کہ آپ لوگ کون ہیں اور چراغ دین کے اس بھونڈے کو آپ نے کیوں روک دیا۔“

”بہر حال چلے جیئے ادا جانے کے لئے ہواں ہی پہلی آئیے اس سلسلہ میں گفتگو بھی ہو جائے گی۔“

”ہاں ہاں! زمیندار صاحب ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اپنا یہاں آنے کا مقصد بیان کر دیں۔ شیرخان نے کہا اور پھر وہ کرسیاں گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

”پہلے تو آپ لوگ اپنا تعارف کر لیں۔ زمیندار بولا۔“

”ان کا نام رخسانہ ہے۔ زجران شیرخان نے خضرت آمینہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اور زمیندار جلدی سے کھڑا ہو گیا اس نے رخسانہ کی طرف اٹھ کر بڑھایا۔ موزوں ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا بد بخت لیکن رخسانہ نے صرف سر کی جنبش سے اسے سلام کیا اور زمیندار بھینپنے ہوئے انداز میں بول گیا۔

”اور میرے ہونے اس نے وہی کو یہ آرزو نکالی۔ اور پھر شاید اس گدھے نے ان دونوں سے تعارف کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ انہیں چائے کی جانب متوجہ کرنے لگا۔ رخسانہ کے سلسلے میں وہ جس بھونڈے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا اس سے رخسانہ کو سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی لیکن شیرخان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”میرا خیال ہے آپ ہم سے جاری آمد کے سلسلہ میں گفتگو کرنے والے تھے۔ زمیندار صاحب۔“

”ہاں۔ آں ہاں۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ اصل آپ لوگ نہ جانے کیوں ایسے آگ رہے۔ میں نے میرے قریبی دوستوں سے قریبی مہمان ہوں۔ قریبی عزیز ہوں۔“

”تو یہ باتیں تو زمین سے نکل ہی جاتی چاہئیں۔“ لڑکی نے سرخشا

زمیندار نے لڑکی کی جانب دیکھ کر کہا۔

”یشک بیشک! میں تو آپ کو خرابوں میں دیکھا کرتی تھی“  
رخسانہ نے کہا اور زمیندار کے ہاتھ سے سچے چھوٹ گیا۔  
”کیا سائل! اس نے بڑھائی ہوتی نگاہوں سے پہلے  
محرمات پھر شہر خان کی جانب دیکھا

”ہاں زمیندار صاحب! یہ دونوں میرے ملازم ہیں اور  
میرے ہی ایما پر مجھے یہاں تک لاتے ہیں۔ کیا آپ یقین کریں گے  
کہ آپ میرے خرابوں کے شہزادے ہیں؟“

”ارے نہیں۔ ارے نہیں“ زمیندار پرستور بڑھایا ہوا  
تھا۔ وہ گہری نگاہوں سے رخسانہ کو دیکھ رہا تھا لیکن رخسانہ کے  
اناز سے یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی مذاق یا طنز کر رہی ہے  
زمیندار گہری گہری سانس لینے لگا۔

”کیسے ممکن ہے میں رخسانہ! میں نے تو آپ کو پہلے کہا  
نہیں دیکھا“

”میں اسے اپنی ہتھی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتی ہوں“  
رخسانہ ایک گھٹئی سانس لے کر بولی۔

”ارے گڑ۔ ارے گڑ۔ ان دونوں کے سامنے آپ ایسی  
باتیں کر رہی ہیں۔ مجھے تو بڑی خشم آ رہی ہے۔ زمیندار گدھے بن  
سے بولا۔

”میں آپ سے کہہ چکی ہوں چاندین کہ یہ دونوں میرے ملازم  
ہیں۔ مجال ہے کہ میرے کسی معاملہ میں مداخلت کر سکیں۔ میں اپنے  
طو پر مطلق العنان ہوں۔ والدین مر گئے ہیں۔ اور اپنی اتنی بڑی ہڈی  
کریں تنہا ہی نبھالے ہوئے ہوں“

”مگر آپ ہیں کون، کہاں رہتی ہیں؟“

”شہر میں رہتی ہوں نہ جانے میری تقدیر نے مجھے یہ غم کیوں  
دے دیا۔ طویل عرصہ تک تو میں تمہاری تلاش میں بھٹکتی رہی نہ جانے  
کس طرح مجھے معلوم ہوا کہ تم جلازم چار دن سے اتدم یہاں تھے پھر  
”تعمیر کی بات ہے۔ عقل سلیم نہیں کرتی“ زمیندار کا تپنا  
بھول گیا تھا۔

شہر خان اور محمد خان ہتھکڑیاں اپنی ہنسی برداشت کے نچرتے  
تھے۔ لیکن رخسانہ بڑی کاسمانی سے اپنا دل ادا کر رہی تھی۔ کافی دیر تک  
خاموشی رہی۔ اور چاندین کی آواز ابھری۔

”تو۔ تو آپ صرف میرے لئے آئی ہیں“

”ہاں چاندین۔ اب تمہاری ہنسی ہے کہ تم جاؤ تو مجھے  
ٹھکانا دے“

”ارے نہیں، چاندین بیوقوف ٹھکانے ہی ہے نہیں  
ٹھکانے کا کیا سول ہے اور وہ جو کہتے ہیں کہ محبت یک طرفہ نہیں  
ہوتی۔ میں نے جب تمہیں دیکھا تو مجھے لڑکھوس ہوا جیسے پہلے کبھی

دیکھ چکا ہوں۔“

”واقعی“ رخسانہ خوش ہو کر بولی۔

”مگر اپنی عقل کام نہیں کرتی، آؤ یہاں سے اٹھیں، میں اپنے  
کمرے میں چل کر تم سے گفتگو کروں گا“

”چلو! رخسانہ فوراً تجارہ مچائی اور چاندین ان دونوں کو نظر انداز  
کر کے باہر نکل گیا۔

محمد خان شیر خان کی شکل دیکھتا تھا اور شیر خان محمد خان کی  
پھر وہی ہی نہیں پڑے۔ تب محمد خان گہری سانس لے کر بولا۔

”میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہاں اس تم کا کوئی گلاسر  
شروع ہو چکے گا“

”گدھوں کو مزہ دیکھنا پڑتا ہے محمد خان، تم کو کونسا لہو  
کس طرح چاروں عمل کے چت ہوتا ہے“

”مگر میرے دوست! تم اس کی زندگی سے واقف نہیں ہو۔  
کہیں ایسا نہ ہو کہ رخسانہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے“ محمد خان نے

تشریح تک لہو میں کہا۔  
”محمد خان رخسانہ نے تمہیں ایک بات کہی تھی۔ اس نے کہا  
تھا کہ اس کے ہاتھ کی ایک فرب چاندین کی زندگی کا پورا بیجا کشتی  
ہے اور یہ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ ماشل آؤس سے واقف  
ہے اور چاندین جیسے لوگوں کے لئے بہت کافی ہے“

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

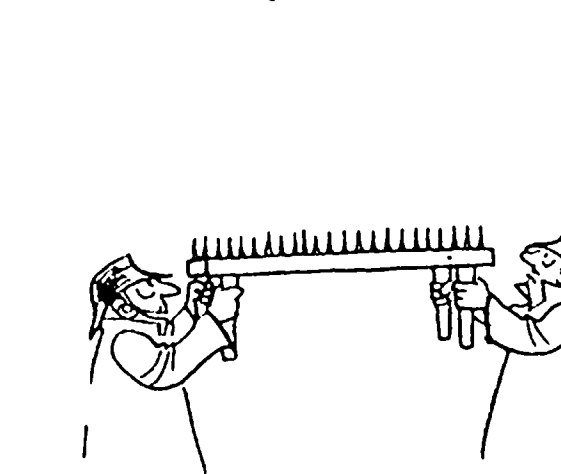
”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔

”اور۔ میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ تمہارا یہ کارخانہ ہی ہر تنگ  
ہے“ محمد خان نے گرج کر جھٹکتے ہوئے کہا اور شیر خان ہنسنے لگا۔



”خا ہر ہے چاندین کی مجبور۔ اس عام کمرے میں تو نہیں رہ سکتی  
تھی میں میں مہانوں کو ٹھہرایا گیا تھا۔ چنانچہ وہ رخسانہ کو لے کر اپنی  
خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑے تھے۔ آج  
شب تو پہلی لڑکیوں کو لڑکے ان کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ ان  
لڑکیوں نے اس سے دلربا بندگی کا اظہار کیا تھا اور کبھی خوشی سے  
اس کی آغوش میں آتی تھیں۔ لیکن چاندین کی زندگی میں یہ پہلی لڑکی تھی  
جس نے اس سے الفت کا اظہار کیا تھا۔ الفت بھی وہ ہر وقت کھیلنے  
کی کتالوں میں اس سے پڑھتی تھی۔ یعنی خرابوں میں کھینے والی باتیں۔ اسے  
اپنی تقدیر پر ہنسنا تھا۔ کیا وہ کبھی کسی کے خوابوں کا شہزادہ ہو سکتا  
ہے۔ رخسانہ بے تکلف اس کے ساتھ جا رہی تھی اور کبھی خراب گاہ میں  
پہنچ کر اس کی نگاہوں کو اس کے چاندین کو دیکھا۔

”چاندین! کیا کسی کی آرزوں کا پھل اسے اس طرح بھی مل  
جاتا ہے۔“ اس نے سوال کیا۔

”کیا مطلب۔“ چاندین کی مرنی عقل میں اس جمل کا مطلب  
نہیں آیا تھا۔

”میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا چاندین! جس نے میری راتوں  
کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ جس نے میرے خیالات کو منتشر کر دیا ہے  
ایک دن وہ میرے لئے قریب اور سامنے ہو گا کہ میں اسکی سانسوں  
کی آواز تک سن سکوں گی“

”رخسانہ! میری بھروسہ نہیں کرنا۔ خدا کے واسطے  
مجھے بتاؤ سب کیا ہے“

”جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ درست ہے یا مجھے بیوقوف بنا رہی ہو  
“ اور چاندین میں خود کشی کر لوں گی۔ اگر دوبارہ تم نے یہ الفاظ  
کہے۔ کہہ دیتی ہوں خود کشی کر لوں گی۔ میں بھلا تمہیں بیوقوف بنانے کا  
تعمیر کر سکتی ہوں“

”لیکن رخسانہ! یہ ساری باتیں تو حقے اور کہانیوں کی باتیں ہیں  
حقے کہانیوں کی باتیں ہیں تمہارا کیا خیال ہے چاندین بکریا اس دنیا  
میں نہ سب کچھ ہوتا ہے جو بیدار عقل ہے۔“ میرا خیال ہے نہیں، جتنے  
حقے ترتیب دیتے جلتے ہیں وہ عقل پرستی ہوتے ہیں۔ تم خود سوچو اپنے اصول  
کو محسوس کرو۔ یہ ساری چیزیں جنہیں تم ایک خیال کی حیثیت دیتے ہو کیا  
عملی شکلیں نہیں رکھتیں۔

”ہم سب وہی کچھ سوچ سکتے ہیں چاندین جو اس دنیا میں ظہور پزیر  
ہوتا ہے۔ چنانچہ تم دل سے نکال دو حقے کہانیوں کی باتیں حقیقت سے  
دور ہوتی ہیں میں تمہارے پاس اپنی زندگی کا ہر مقصد لے کر آئی ہوں  
اس کے سلسلے میں تم سے دیر تک گفتگو کرنا چاہتی ہوں“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

یہ لڑکی اسے ضرورت سے زیادہ ہی پسند آئی تھی۔ تھی بھی خوبصورت  
اور کچھ شہر کی لڑکی چاندین نے کبھی شادی کے بارے میں نہیں سوچا تھا  
لیکن بیوی کے بارے میں کبھی اس کے ذہن میں کوئی تصور ابھرتا تو  
وہ اس لڑکی سے مختلف نہ ہوتا۔ گاؤں کی دو شہزادیاں تو خواب گاہ کی رونق ہی  
پر صاف سکتی تھیں۔ انہیں تو صرف ایک ایسا بچوں کا تھا جس کا  
سے توڑا سونگھا اور بچوں کی زندگی میں ڈال دیا لیکن ضرورت چرغ دین کی  
وسیع و عریض جام اور اس کی زندگی میں شریک ہر وہ کم از کم کام خوروں  
سے تو منفرد ہوا اور رخسانہ میں یہ تمام خوبیاں اسے نظر آ رہی تھیں۔ چنانچہ وہ  
انگڑا کر گیا تھا۔

”ہاں ہاں رخسانہ! تم نے تو چند ہی منٹوں میں چاندین کو اپنا غلام بنا کر  
رکھ دیا ہے“

”نہیں چرغ دین! غلام تو میں تمہاری ہوں۔ میں تو تم سے اپنی  
قسمت کا فیصلہ سننے آئی ہوں“

”کیا فیصلہ! کچھ تو کچھ رخسانہ! چاندین نے رومانی ہنس کر کشش کی۔  
”میں تم سے شادی کرنے کی خواہشمند ہوں چاندین! اگر تمہیں میری  
بات منظور ہو تو تیار۔ شام کو میرے آدمی سے گفتگو کر لینا اور اس کے بعد  
جس طرح سے بھی چاہو ترتیب پائے“

”اوہ۔ اوہ۔ اتنی جلدی یہ سب کچھ ہو چکے گا۔ میں نے سوچا  
بھی نہیں تھا رخسانہ۔

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ چاندین نے کہا اور رخسانہ خوشی  
سے دیوانی ہو گئی۔ لیکن چاندین کی پیش قدمی کے جواب سے اسے روک دیا تھا۔

”نہیں چاندین! عزت نفس کبھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہم لوگ اب  
اسے قریب نہیں آئیں گے کہ بدویں اس قریب کی لذت کو بھلا بیٹھیں۔“

”تم شہر کی رہنے والی ہو رخسانہ! جیسے کہتی ہو وہی ٹھیک ہے۔“  
چاندین خوشی سے پھولا نہیں سا رہا تھا۔

”شام کو کھانے کے بعد حویلی کے ایک بڑے کمرے میں چاندین  
نے رخسانہ کے ساتھیوں کو بھی مدعو کر لیا۔ رخسانہ تو پہلے سے ہی اس کے  
پاس موجود تھی۔ چاندین اس وقت ضرورت سے زیادہ نکھر کر انظر  
آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل کے ڈورے تھے۔ ہنر وں پر پان لالی  
بھی ہوئی تھی۔ لباس بھی اس نے شاید سب سے خوبصورت ہی نکال کر  
پہنا تھا اور باز کا پھیلا سکران کے درمیان آ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے  
پر لچائی لچائی سی سکر اٹھتی تھی جیسے کسی دلہن کے چہرے پر ہوتی ہے اس  
نے رخسانہ کی جانب دیکھا اور بھونڈے انداز میں بولا۔

”بات شروع کرو رخسانہ“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں کیوں نہیں“ چاندین نے ایک گہری سانس  
لے کر کہا۔



”دراصل ہم اس رقم کا حساب کتاب کرنے آئے ہیں چراغ دین جو تم نے میرے دوست محمد خان سے لی تھی۔ یہ رقم اتنی بڑھ چکی ہے چنانچہ کراہی تمہاری ساری جائداد اور دولت اس کی ادائیگی کے لئے ناکافی ہے چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ تم پانچ سو روپے دوست محمد خان کو دے دو“ شیرخان نے کہا اور چنانچہ اس قدر انہیں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

”کیا مطلب، کیا مطلب، کون محمد خان کسی جائداد پر رضامند ہوا؟“

”تو تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟“

”شیرخان، رضامند نہ ہوں شیری خان کی طرف دیکھا۔“

”پاکل معلوم ہوتا ہے؟“

”کام کی بات کرو اور یہاں سے چلو۔ تم کس پاگل خانے میں آچھنے ہو؟“

”اے لے تم لوگ حد سے زیادہ بڑھ رہے ہو۔ کیا تم لوگ چراغ دین سے واقف نہیں ہو۔ کھال بچوں لوں گا اس لٹی میں تمہاری۔ یہ میری بستی ہے۔“

”لیکن اب تو مولوی عبدالقدوس کی ہے۔“

”نوں عبدالقدوس؟“

”یہ جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں، انہیں نے نوجوان نے داڑھی والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو تم سب پاگل ہو گیا۔ اور تو نے مجھ سے دعوہ کیا ہے؟“

”میں تجھے ٹھیک کر دوں گا۔ کیا تو اب میرے پیچھے نکل سکتی ہو؟“

چراغ دین دنگ کرکھڑا ہوا۔

”بیٹے چراغ دین۔ اچھا، نوجوان نے پیار بھری انداز میں کہا اور چنانچہ نے خوشخوار انداز میں پلٹ کر لے دیکھا لیکن پھر اس کے ہاتھ سے نوجوان نے نوجوان کے چہرے پر ہنسی لگی اور چنانچہ نے میری جان نوجوان نے اسی انداز میں پکارا اور چنانچہ نے کہا۔

”اور چنانچہ نے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اچھے انسان کسی کی ہنسی ہوتی بات بن لیتے ہیں کیوں؟“

”ہاں۔ ان لیتے ہیں۔“

”تو تم بھی مان لو بیٹے۔ مانو گے؟“

”اھ ہوا انوں گا۔“

”تب پھر ان کاغذات پر دستخط کر دو گے۔ نوجوان نے ایک نالی کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ جہاں جہاں نشانات لگے ہوئے ہیں وہاں دستخط کر دو۔ نوجوان نے تمام کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔

چراغ دین نے نہایت خاموشی سے دستخط کر دیئے اور پھر گردن جھکا کر کھڑکھڑا گیا۔ بیٹے چراغ دین۔ جو کچھ تم نے کہا گیا ہے تم وہی کر دو گے اس سے۔ مرنے کا خوف نہیں کرو گے، غور سے سوچو میں کیا کہہ رہا ہوں۔

نوجوان اسے ایک تقریر مانے لگا۔ محمد خان تعجب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چراغ دین کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ اور پھر چرچر پلین باہر نکل گیا۔

”یہ کیا ہو؟“ محمد خان نے پوچھا اور اس نے کہا۔

”میں نے کہا تھا نا محمد خان۔ وہ سب کچھ ہو گیا جو میں چاہتا تھا۔ اب چراغ دین کی ساری جائداد تمہاری یعنی عبدالقدوس کی ہے۔“

”میری عقل کام ہی نہیں کر رہی۔ محمد خان پاگلوں کے سے انداز میں گردن جھٹکنے لگا۔

”محمد خان عقل کے استعمال کا وقت آگے آئے گا۔ کیوں اس بے چاری کو تکلیف دے رہے ہو۔ فی الحال اسی طرح چلنے دو آؤ۔ رضامند آ جاؤ۔ محمد خان بے چارے کو باہر کی سیر کر آئیں۔ سنا ہے دیہات کی آب و ہوا بہت اچھی ہوتی ہے۔ آ جاؤ شیرخان نے کہا اور شیوں باہر نکل آئے۔

\* \* \*

زمیندار کے مکان کے احاطے میں سبھا بیٹھی ہوئی تھی۔ چراغ دین جی ابھی نہیں آئے تھے۔ بہت لوگ جمع تھے۔ ڈر ڈر کے قلعے داخل کو بلا گیا تھا۔ اور پیغام یہ تھا کہ سب اپنے کام چھوڑ کر آجائیں۔ جلا ضروری کام ہے۔

اس وقت سب جو بیگناہ کر رہے تھے۔ ”یہی کیا بات ہے کرنی خاص بات ہوئی ہے کیا؟“

”اللہ جانے۔ یوں لگتا ہے جیسے زمیندار چنانچہ نے کوئی خاص بتانے والے ہوں۔“

”دیکھو کیا بات ہے؟“

”اودہ زمیندار نے کہا۔ کسی نے کہا۔ چراغ دین اونچی پڑی ہاتھ بڑھے کر دفتر سے آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے اس کے تمام چل رہے تھے۔ پھر وہ چوہال کے تحت پراگیا اور تمام قبیلے والوں نے اسے سلام کیا۔

”ولیکم السلام۔ بیٹھو بھائیو۔ جلتے ہو آج میں نے تمہیں کیوں بلا یا ہے۔“

”ضروری کوئی خاص بات ہوگی زمیندار صاحب۔ تم سب تو بہت ہریشان ہو گئے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے کہا۔

”ہاں خاص ہی بات ہے بھائیو۔ ایسی خاص بات کہ تم سنکر

چراغ دین نے کہا۔ آج میں نے تمہیں جہاں کرنے کے لئے یہاں بلا یا ہے۔ چراغ دین نے ہنس کر کہا اور لوگوں کو حیرت ہوئی۔ آج تو چراغ دین بڑا خوش اخلاق ہو رہا تھا، حالانکہ اس سے پہلے تو وہ ان لوگوں سے یہ سیدھے سیدھے بات نہ کرتا تھا۔ بہر صورت کسی نے کچھ نہ کہا۔

”کیا بات ہے زمیندار، آج تو آپ بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔ ایک بڑھا آؤ گی بول ہی پڑا۔

”ہاں بھائیو، بعض اوقات ذمہ داریوں کا بوجھ انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے، میں جیسا بھی تھا تم لوگوں کے ساتھ میں نے خاصا وقت گزارا ہے، اور میں نہیں جانتا کہ میرے بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے، میں اپنے آپ کو اچھا نہیں کہوں گا۔ بھائیو اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھا ہوتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا، بات یہ ہے کہ میں شہر جا جا کر جو کچھ کرنا ہوا اس کی تفصیل بتانا میرے لئے ضروری نہیں ہے لیکن یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ میں نے اپنے دوست مولوی عبدالقدوس سے بڑی بڑی زمینیں خریدیں اور یہ زمینیں میں اپنی بڑی ماؤوں کی منظر تار، حتیٰ کہ ان کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ میری حیثیت بھی ان کے آگے ختم ہو گئی۔ مولوی عبدالقدوس بے چارہ شریف آدمی ہے۔ بلاشبہ وہ ایک سرمایہ دار ہے لیکن اس میں سرمایہ داروں کی کسی کوئی بات نہیں، اس نے کبھی مجھ سے تقاضا نہیں کیا لیکن میری غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں اس کی اتنی بڑی دولت دلتے بیٹھا ہوں، چنانچہ میں نے اسے بلا لیا۔ ہمارے اور اس کے درمیان حساب ہوا اور مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنی حویلی، زمینیں، شان و شوکت سب کچھ چھوڑ چکا ہوں اور اس کے باوجود مولوی عبدالقدوس کا تو فسادار ہوں۔ تو بھائیو۔ ہم لوگوں نے باہمی تعاون سے اپنے حساب چکنا لئے۔ چنانچہ اب میں اپنی تمام جائداد مولوی عبدالقدوس کے حوالے کر دی ہے اور اس کے کاغذات بھی مولوی عبدالقدوس کے پاس میں۔ چنانچہ اب تمہارے سنے زمیندار مولوی عبدالقدوس ہوں گے۔ مولوی صاحب آگئے۔ آئیے، چراغ دین نے کہا۔ لوگوں کے منہ حیرت سے کھل گئے تھے۔ تب چراغ دین نے کاغذات کا ایک پلندہ مولوی عبدالقدوس کی طرف بڑھا دیا اور کہنے لگا۔

”مولوی صاحب جو کچھ رقم اور تورہ ہی گیا، لیکن بہر صورت میں نے آپ کا قرض ادا کر دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے چراغ دین جو کچھ بڑا ٹھیک ہوا مولوی عبدالقدوس نے بھاری لہجے میں کہا۔

”تو بھائیو آج سے تمہارے سنے زمیندار اور میری ہر چیز کے مالک مولوی عبدالقدوس ہوں گے۔ میں آج ہی سے یہ سب کچھ روک دنگا۔“

”مگر زمیندار، چراغ دین جی۔ بہت سی آوازیں بھری۔“

”بس بس اب مجھے زمیندار نہ کہو، میں ایک تلاش آدمی ہوں جو

اپنی بری حرکتوں کا شکار ہو گیا۔

”تمہارا ہی خسر من چاہتے تھا چراغ دین۔ ایک طرف سناؤ اور اب۔“

”بلکل ٹھیک کہتے ہو، کج بخت نے سستی والوں کا ناک میں مگر دیا تھا۔ دوسری آواز اٹھ رہی اور چہرے پر مزہ سے ایک نہ ایک لفظ نکلنے لگا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے، کیونکہ چراغ دین اب ان کے سر پر تسلط نہیں تھا۔ تب مولوی عبدالقدوس نے کہا۔

”بھلا تو یہ مناسب نہیں ہے، چراغ دین نے تمہارے ساتھ برکیا تھا۔ خدا نے اس کے ساتھ بلکہ دکھایا۔ وہ جاہل ہے اب اسے معاف کر دو۔“

”ارے لحتت ہے اس پر، اس کم بخت کو معافی دی جاسکتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر ہمارا بس چلے تو ہم اس کا پورا بدن نوح کر چھینک دیں، ہمارے گلے کے گردیں ہم اس کے لاش کا بھی پتہ نہ چلنے دیں۔“

”خیر خیر، تم نے اس انتقام کے جذبہ کو ختم کر دو۔ وہ اپنی سازشوں کی بازی ہار چکا ہے اور اب یہ سب کچھ ہمارا ہے عبدالقدوس نے نرم لہجے میں کہا۔

”زمیندار عبدالقدوس زندہ باد۔ زمیندار عبدالقدوس زندہ باد اور شیرخان کے ہونٹوں پر سکرامبٹ پھیل گئی۔ تب اس نے جبک کر رضامند کی طرف دیکھا۔

”دیکھا خراسا، تم نے، وقت کس طرح کر ڈٹا ہے اور وقت کے بچاری کس طرح آنکھیں بدل لیتے ہیں۔“

”تھوڑی دیر کے بعد سبھا برخواست ہو گئی۔ بڑے بڑے لوگوں نے مولوی عبدالقدوس یعنی محمد خان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا، اور حسابات پیش کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ محمد خان کی حالت ایسی تھی جیسے جگتے میں خراب دیکھ رہا ہو، زمیندار کی حویلی میں اس بار جب وہ داخل ہوا تو اس کی حیثیت، انگوں کی سی تھی۔ اندر سامان باندھا جا رہا تھا، چراغ دین کے خاص خاص آدمی رخصت کی تیاری کر رہے تھے۔ تب شیرخان نے محمد خان کو اشارہ کیا۔

”ان سے بات کرو۔“

”کیا کہوں؟“ محمد خان نے پوچھا۔

”سب کو روک لو، ظاہر ہے تمہیں ان کی ضرورت ہوگی۔“

شیرخان نے جواب دیا اور محمد خان شیرخان کی ہدایت پر عمل کرنے لگا اس نے کہا تم لوگوں کو جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، تم سب جس طرح بیباک کام کرتے رہے ہو کرتے رہو گے اور تمہیں وہی سب کچھ لے گا جو تمہارا ہے۔“

”مولوی عبدالقدوس زندہ باد۔ مولوی عبدالقدوس زندہ باد۔“

نعرے پھرنے لگے۔ ان لوگوں کو محمد خان نے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی جو زمیندار کے خاص آدمی تھے۔

رخسانہ، شیرخان اور محمد خان ایک بڑے کرے میں جا بیٹھے انہوں نے باہر ملازموں سے کہہ دیا تھا کہ ابھی وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتے۔ آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کاغذات محمد خان کے پاس موجود تھے جن کی رو سے وہ اب اس پر رے علاقے کا مالک تھا۔

”میری ذہنی حالت بہت خراب ہے شیرخان۔ بخدا میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ میں اپنا ذہنی توازن نہ کھو بیٹھوں۔“

”یہ تمہارا ذاتی فعل ہو گا محمد خان اور میں تمہیں ذہنی توازن کھو بیٹھنے سے نہیں رکھوں گا۔ ہماری مددالت نے فیصلہ کیا تھا کہ تمہاری جائداد تمہیں واپس دلائی جائے۔ چنانچہ وہ تمہیں مل گئی۔ صبر سے کام لو گے تو تمہاری بہن بھی تمہیں مل جائے گی۔“

”لیکن میں۔“

”ہاں کہو۔“

”کیا میں عبدالقدوس کی حیثیت سے زندہ رہوں گا۔“

”ہاں۔ اس لئے محمد خان کہ محمد خان کو کچھانی ہو چکی ہے۔ اور اب اسے منظر عام پر نہیں رہنا چاہیے۔“

”اوہ۔ لیکن میری بہن؟“

”اس کی تلاش کی جستجو ہی ہم پر ہے۔“

”لیکن اس حیثیت سے وہ مجھے کس طرح پہچانے گی؟“

”اسے بھی پوری تفصیل بتادی جائے گی۔ اور اگر وہ تمہیں چاہتی ہے تو تمہارے منہ کو ہمیشہ بند رکھو گی۔“

”محمد خان نے سر ہلایا۔“

بہر حال دوسرے ہی دن شیرخان اور رخسانہ اس رخصت ہو کر واپس چل پڑے۔

فضل خان کو اب ان معاملات سے کافی لچھی ہو چکی تھی۔ اس کا دوست عجیب و غریب خصوصیات کا مالک تھا۔ لیکن انہیں فضل خان کی سوچ بھی بدل گئی تھی۔ ریزین مدالت میں بے شمار نقد ملے گئے تھے۔ وہ فیصلے تو اس کے حالات میں ہوتے زیر غور لائے جلتے اور پھر ان پر از سر نو غور کرتا۔ جن مجرموں کے بارے میں اندازہ ہوتا کہ وہ بے گناہ ہیں انہیں سزا نہیں پانے دیا جاتا تھا۔ کئی باجیل ٹوٹ چکی تھی اور قیدیوں کو نکال لیا جاتا تھا۔

سوکھام سخت پریشان تھے۔ بہت سے محکمے ان لوگوں کو تلاش کر رہے تھے۔ جو اس پوری کارروائی کے تحت وہاں تھے ان کے بارے میں کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ بات ہی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بہر حال ریزین مدالت گئی تھی اور اس کے لئے بیٹھار محکمے ترتیب پا چکے تھے۔ اب تو فضل خان بھی اس سلسلے میں بڑے اعتماد سے کام کرنے لگا تھا۔ تب ایک دن شیرخان نے فضل خان سے کہا۔

”کیا خیال ہے فضل خان۔ موجودہ وقت کے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”موجودہ وقت سے تمہاری کیا مراد ہے شیرخان؟“

”کیا ہماری کاہر و لائی بہتر طور سے نہیں چل رہی ہے؟“

”اوتے کلفام۔ تو نے تو اس شہر کی کا یا ہی پلٹ دی ہے۔ تو نے فضل خان کو کیل سے کیا بنا دیا۔“

”اب تو تم خود ہی اس مدالت کو چلا سکتے ہو۔“

”کیا مطلب ہے تیل شیرخان؟“

”دراصل فضل خان۔ یہ میرا شوق ہے۔ اور اسی شوق نے مجھے زندہ رکھا ہے۔ میں حالات کے ہاتھ بھروسہ کر رہا ہوں۔ بنا تھا۔ بڑا بے بس انسان تھا میں، مجھے جرائم سے نفرت تھی لیکن حالات نے مجھے اس طرف دھکیل کر دی دم لیا۔ تب فضل خان میں نے ایک فیصلہ کیا۔“

”مجھے اس دنیا سے نفرت نہیں ہوتی لیکن میں نے ہمدردی سے اپنے جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچا۔ میں نے سوچا۔ بے جا ہے بھی میری طرح حالات کی چکی میں لپتے ہیں اور اس دلدل سے نکل نہیں پاتے۔ تو میرے دوست میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان کی مدد کر دوں گا۔ اور اس دن سے میں نے اپنا شعار ہی بنالیا۔ آج دنیا کے بیشتر جرائم مالک میں ایسی ریزین مدالتیں کام کر رہی ہیں اور ان مجرموں کی حیثیت کا تعین کیا جاتا ہے جو عادی مجرم نہیں ہوتے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اب تم یہاں اس ملک میں اپنا کام بخوبی سمجھا سکتے ہو۔“

”اور شیرخان؟“

”ابھی دنیا اور وسیع ہے فضل خان۔ میری ضرورت دوسروں کو ہے۔ میں ان کے درمیان جاؤں گا کسی اور شہر میں کسی اور ملک میں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا شیرخان۔“ میرے اور تیرے درمیان یہ بات تو طے نہیں تھی۔“

”ہاں نہیں تھی فضل خان لیکن میں جانتا ہوں کہ اب تم یہاں کے معاملات بخوبی سمجھا سکتے ہو۔ اس لئے مجھے دوسروں کی خدمت کا موقع دو۔“

”نہیں شیرخان نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تو تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا تھا۔“

”کیا فضل خان؟“

”شیشی کی کوجانتے ہو؟“

”کون شیشی؟“

”رستم پور کے نوابوں میں شمار ہوتا ہے۔ اسمگلر ہے۔ اور

بین الاقوامی چپانے پر کام کرتا ہے۔“

”میں نے کبھی نہیں سنا اس کا نام۔“

”ظاہر ہے ابھی ہم نے اسمگلر کی طرف توجہ نہیں دی۔“

”دیں گے۔ ضرور دیں گے۔“

”مگر تم تو جا رہے ہو شیرخان۔“

”ابھی تو نہیں جا رہا فضل خان۔ اگر شیشی کوئی چیز ہے تو اسے دیکھ لیں گے۔“

”تو نے دل تو ڈر دیا ہے شیرخان۔ اب کام کرنے میں وہ مزا نہیں آئے گا جو آتا تھا۔ تو چلا جائے گا تو کیا خاک مڑائے گا۔“

”فضل خان۔ اگر میں چلا جاؤں گا تو کیا کبھی واپس نہیں آؤں گا یہ میری برائی ہے فضل خان اور میں اس کی خبر گیری کرتا رہوں گا۔“

”دودھ۔“

”ہاں فضل خان ہی یہ طریقہ کار ہے۔“

”تب ٹھیک ہے۔ وہ دن میں تو آ رہی کیا تھا۔“

”تم نے پوری بات ہی کب کبھی تمہیں فضل خان کی کسی مرحلے پر تمہیں جب بھی کوئی الجھن پیش آئے گی میں تمہارے پاس ہوں گا۔“

”پھر شیشی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”کیا چاہتے ہو؟“

”دراصل شیشی بہت بڑی شخصیت کا مالک ہے۔ اصلی

سوکھام سے اس کی بڑی دوستی ہے اس لئے کوئی اس پر ہاتھ نہیں ڈالت۔“

”اوہ فضل خان تمہیں پہلے ہی اس کے بارے میں بتانا

چاہیے تھا۔“

”ہاں بس اتفاق ہے۔“

”کہاں رہتا ہے؟“

”رستم پور میں۔“ فضل خان نے جواب دیا اور شیرخان گردن

بلانے لگا۔

خوبصورت گھوڑا گاڑی بڑی سڑک سے چھوٹی ذیلی سڑک پر

آزگی سے بولنے نظر آنے والی عظیم الشان عمارت تک جاتی تھی۔

گھوڑے سبک رسی سے دوڑ رہے تھے اور پھوڑی دیکھ کے بعد

وہ عمارت کے وسیع دروازے پر پہنچ گئی۔ پھانک پر کھڑے

ہوتے چوکیدار نے بڑے ادب سے دروازہ کھول دیا تھا۔ گھوڑا

گاڑی اندر داخل ہو گئی۔ چوکیدار اس طرح جھک گئے تھے جیسے آنے

والا کوئی بڑا ہی ہنر مند جہان ہو، پھر وہ سیدھے ہو گئے۔

پورے کورس جو شخص گھوڑا گاڑی سے اترا وہ سفید رنگ کے

انتہائی نفیس سوٹ میں لبوس تھا، سر پر چوڑا ہیٹ جس میں خوبصورت

کلیاں آڑی ہوئی تھیں، ہاتھ میں پتلی سی چھڑی تھی جو کسی چوکیدار دھات

کی تھی ہوئی تھی۔ دروازے پر کھڑے ہوئے دو خوش پوش نوجوانوں

نے اس کا استہمال کیا اور نوجوان نے سر جھکا دیا۔ استقبال کرنے والے

اسے بڑے اہتمام سے اندر لے گئے۔ چند قدم چلنے کے بعد اسے

اپنے ساتھ چلنے والوں سے پر تھا۔

”مشرٹنگی مرہو نہیں؟“

”ہی ہاں جناب، آپ ہی کے منتظر تھے۔ تشریف لائے۔“

استقبال کرنے والوں میں سے ایک نے کہا اور نوجوان ان کے ساتھ

آگے بڑھتا چلا گیا۔

ایک لمبی راہداری طے کرنے کے بعد وہ ایک بڑے کرے

کے دروازے کے سامنے رگ گئے۔ دروازوں پر بڑے

خوبصورت شیشے لگے ہوئے تھے اور شاید ان کا نظام خود کار تھا۔

دروازے دونوں سمتوں سے کھل گئے اور نوجوان اندر داخل ہو گیا۔

انداز انتہائی نفیس قالین کے اوپر نہایت خوبصورت

صوفے بچھے ہوئے تھے اور ان صوفوں میں سے ایک صوفے پر ایک

شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہنڑوں میں سگار دبا ہوا تھا اور اس

کی آنکھیں دروازے کی سمت لگی ہوئی تھیں۔ آنے والے کو دیکھ

کر ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر بغیر کے آثار نمودار ہوئے اور

پھر اس نے سگار ہنڑوں سے نکل لیا۔

”ہیلو۔“ نوجوان نے سگارا گردن تم کرتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“ شیشی نے بھاری آواز میں کہا۔ لیکن اس کے چہرے

پر کوئی استقبالی مسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے نوجوان کے

قریب کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں کو دیکھا اور پھر اشارے سے اسے

اپنے نزدیک بلا لیا۔ دونوں افراد اس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ یہ کرن

ہے شیشی نے پرچھا۔ ادا ان دونوں کی آنکھیں تعجب سے کھیل گئیں۔

”آپ کے یہاں جناب۔“

”کیا بکو اس نے شیشی آواز دبا کر بلا۔“

”کک کیا مطلب؟ وہ دونوں متحیرانہ انداز میں شیشی کی صورت

دیکھنے لگے۔“

”یہ وہ نہیں ہے۔ شیشی نے بڑے لہجے میں بولا اور شاید اس کے یہ

الفاظ نوجوان نے سن لئے تھے۔“

”ہاں میں وہ نہیں ہوں لیکن جو کچھ ہوں میں ان خیال سے آپ کو

مجھ سے مل کر خوشی ہی ہوگی مشرٹنگی۔ وہ آگے بڑھ کر بولا اور شیشی سخت

نکاہت سے اسے دیکھنے لگا۔“

”آپ جو کوئی بھی ہیں مشرٹنگی جس انداز میں یہاں آئے ہیں میرے

خیال میں وہ مناسب تو نہیں ہے۔“

”میں آیا نہیں ہوں مشرٹنگی لایا گیا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ لوگ جنہوں نے ریلوے اسٹیشن پر میرا استقبال کیا تھا مجھے

خود ہی اپنے ساتھ گاڑی میں لئے اور پھر یہاں تک لے آئے۔“

”اور وہ غلط نہیں کے شکار ہو گئے تھے۔“ میرا ایک پہلے آنے

والا تھا۔ شاید ان لوگوں نے ہی سمجھا کہ میرے وہ مہمان تھے۔  
 ”مشرقی اپنے گھر پر شخص آجائے اسے مہمان تو سمجھا جاسکتا ہے۔“ باقی رہی بات کہ میں ان لوگوں کے ساتھ کون آیا تو یقین کر ہی میں نے انہیں مطمئن نہیں کیا تھا کہ میں مشرقی کا مہمان ہوں۔ اب یہ چارے مجھے لے ہی آتے تو مجھ کو ہی بہر حال مجھے آپ کے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ زوجان نے کہا۔  
 ”لوگ کہاں سے آئے ہو۔ رستم پور میں تمہارا کیا کام۔“  
 شیشی اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔  
 ”سیاح ہوں، جو جگہ جگہ سے کرتا ہوا تمہارے ملک میں آیا ہوں اور اب یہاں کے سارے معاملات دیکھ رہا ہوں۔ رستم پور سے اسٹیشن پر آنا اور چند افراد سے نزدیک پہنچ گئے۔ انہوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔ اور میں نے سوچا کہ یہاں کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں سو میں یہاں چلا آیا۔“  
 ”عجیب اتفاق ہے بہر حال آج ہی گئے ہو تو شیشی کے مہمان ہوئے۔“  
 ”یہ وہ شکر گزار ہوں۔ یہاں اچھی تھا۔ اگر کچھ درست مل جائیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔“  
 اسی وقت دروازہ کھلا اور چار آدمی دندناتے اندر گھس آئے ان میں سے ایک نے ہسپتال نکال کر زوجان کی طرف کر دیا تھا۔ زوجان حیران نہ گئے اسے دیکھنے لگا۔  
 ”کیا بات ہے؟“ شیشی نے ہماری آواز میں پوچھا۔  
 ”جناب۔ مشرقی کا فون آیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر وہ روانہ نہیں ہو سکے۔ ایک ہفتے کے بعد یہاں کا پروگرام بنائیں گے۔“ لیکن شخص.....  
 ”بھاگ جاؤ گے۔ کیا تم نے ان سے پوچھا تھا کہ یہ کون ہیں؟“  
 ”نہیں جناب تم سمجھو۔ وہ شخص بھلا کر نوا۔“  
 ”میں تمہیں بخوبی سمجھاؤں گا۔ جاؤ شیشی دہاڑا۔ امدہ لوگ گھبراتے ہوئے انداز سے باہر نکل گئے۔ تب شیشی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔  
 ”مجھے یہ دلچسپ اتفاق پسند آیا ہے۔ اور اب تم میرے اسی مہمان کی حیثیت سے تیار کرو گے جو نہیں آیا۔“  
 ”بہت بہت شکر یہ مشرقی شیشی“  
 ”بیٹھو۔ تمہارا نام کیا ہے اور کہاں سے آئے ہو؟“  
 ”میں شیشی کہتا ہوں۔ فلپائن کا باشندہ ہوں۔ زوجان نے بڑے احترام سے اس سے بات چلی۔ اور مشرقی نے ایک ملازم کو بلا کر زوجان شائیس کے لئے چائے وغیرہ لانے کا حکم دیا۔ شائیس اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔

”ارے! تمہارا مسلمان نہیں ہے۔ شیشی نے پوچھا۔“  
 ”موجود ہے۔ ایک سوٹ کپڑے ہے۔ بہر حال تمہارے ملازم اسے مہمان کی تیار نگاہ پر ہی لے گئے ہیں۔ شائیس نے سکرٹے ہوتے کہا کہ اللہ کی قسم لگا۔ پھر سکرٹا ہوا بولا۔  
 ”بڑا دلچسپ اتفاق ہے، بہر صورت تمہاری شخصیت مہمان کی حیثیت سے قبول ہے۔ خوب صورت آدمی ہو اور دلچسپ اور سوزنا۔“  
 ”لوگ یہ حد تک نہیں۔ فلپائن میں تمہارا کیا شغل ہے؟“  
 ”کچھ نہیں کرتا۔ مشرقی، بس یہ کہتا ہے کہ باپ کے نام پر پیش کر رہا ہوں۔“  
 ”اور ہو گیا کرتے ہیں تمہارے ڈیڑھی دہاڑا پر۔“  
 ”حکومت کرتے ہیں۔ زوجان نے جواب دیا۔ اور شیشی تعجب سے اس کی صورت دیکھنے لگا۔  
 ”میں نہیں سمجھا شیشی نے تجھ سے انداز میں کہا۔“  
 ”میں فلپائن کے شاہ کا بیٹا ہوں۔ اور غیر کاری طور پر سیر و سیاحت کر رہا ہوں۔“  
 ”اوہ۔ کیا تم درست کہہ رہے ہو؟“  
 ”ہاں جھوٹ نہیں بول رہا شیشی۔ ضرورت بھی نہیں ہے۔ تم اگر شک و شبہ کا شکار ہو تو تصدیق کر سکتے ہو۔“  
 ”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میرا مطلب ہے حکومت کیا حکومت کو تمہاری آمد کا حکم ہے۔؟“  
 ”اگر علم ہوتا تو میں اس آزادی سے سیاحت نہیں کر سکتا تھا۔“  
 ”زوجان نے جواب دیا اور شیشی تعجب سے اسے دیکھنے لگا پھر سکرٹا بولا۔  
 ”دلیہ صورت سے تو شہزادے ہی معلوم ہوتے ہو۔ بہر حال تم سے مل کر واقعی خوشی ہوئی ہے۔ چائے کا سامان لایا۔ اور چائے کے بعد شیشی نے زوجان کو اس کی تیار نگاہ پر پھوڑ دیا۔ اس نے کہا تھا کہ شام کو وہ اس سے ملاقات کرے گا۔  
 رات کے کھانے کے بعد زوجان آرام کرنے چلا گیا۔ شیشی نے اس سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ اس وقت رات کے تقریباً آدھ بجے تھے جب زوجان اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے دن ہی میں شیشی کی آمد نگاہ دیکھی تھی۔ خواجگاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا اور شیشیوں میں سے شیشی نظر آ رہا تھا۔  
 زوجان بیٹھ گیا۔ اندک ہول سے ہونٹ لگا کر اس نے سٹی سی آواز نکالی۔ شیشی سے وہ شیشی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے عجیب سے لہجے میں اسے پکارا۔ شیشی اٹھو دروازہ کھولو۔ اٹھو شیشی جاگ جاؤ۔“  
 یہ جملہ اس نے بڑی آہستگی سے کہا تھا۔ لیکن دوسرے لمحے شیشی اٹھ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور زوجان اندر داخل ہو گیا۔ ”شکر یہ شیشی دروازہ بند کر دیا۔“ اور شیشی نے دروازہ بند کر دیا۔

”آؤ بیٹھو۔ آئیں کریں گے۔ زوجان نے کہا۔ اللہ کی قسم شیشی اندر نہیں گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن ان آنکھوں میں رونق نہیں تھی۔ دل لگتا تھا جیسے وہ اب بھی سو رہا ہو۔ پھر وہ زوجان کے سامنے ہنر مند ہو کر بیٹھ گیا۔  
 ”اے شیشی مجھے تمہارے بارے میں معلومات دو کا رہیں۔ وہ ساری معلومات جو تمہارے کالے دھندلے کی رہنمائی کرتی ہیں مجھے ان کے بارے میں ایک ایک تفصیل بتاؤ۔“  
 ”بہتر جواب شیشی نے کہا اور پھر شروع ہو گیا۔ اس نے زوجان کو وہ تمام لڑتے ہوئے جیسے جس کا تعلق اس کی زندگی سے تھا۔ زوجان نے ایک چھوٹا سا ٹیپ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا تھا جسے اس نے شیشی سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی اور شیشی نے اسے اعترافات اس کی زبان میں دیکھا اور پھر ہے تھے۔ شیشی بولتا تھا۔ تب زوجان نے سکرٹے ہوتے گردن ہلائی۔  
 ”ہاں شیشی وہ سارے کاغذات اور فائل بھی تم مجھے دیکھ کر میں جو تمہارے ان معاملات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں لیکن آج نہیں۔“  
 ”یہ سکرٹا تم وہ سارے کاغذات لے کر رات بھیک ایک بجے میری آرام گاہ میں پہنچ جانا، پھر ان کاغذات کو ہم آرام سے دیکھیں گے۔“  
 ”بہتر جواب شیشی نے شیشی انداز میں کہا اور تقریباً دیکھنے دیکھنے کے بعد زوجان دہاڑا سے چلا آیا۔ اس نے شیشی کو سونے کی ہلاکت کرنا تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ کل دن کی نشی میں وہ رات کا واقعہ بھول جائے گا۔ شیشی نے اس بات پر بھی گردن ہلائی تھی اور کہا تھا میں کل یہ واقعات بھول جاؤں گا۔“  
 ”لیکن کل رات کو کاغذات لے کر میرے پاس آنا نہ بھولنا۔“  
 ”میں کاغذات لے کر تمہارے پاس آنا نہیں بھولوں گا۔“  
 شیشی نے جواب دیا تھا۔ اور زوجان چلا گیا تھا، دوسرے دن صبح ناشتہ کی میز پر شیشی کی کیفیت بالکل درست تھی۔ اس نے سکرٹا کر زوجان سے رات کے آرام کے بارے میں پوچھا۔  
 ”بہت بہت شکر یہ مشرقی۔ میں سکن سے سوا۔“ لیکن سونے سے قبل مجھے ایک بڑی عادت ہے۔  
 ”وہ کیا ہے؟“  
 ”میں ستاروں کی مدد سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہوں اور اس سلسلے میں انسان بھی میری دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے۔“  
 ”میں نہیں سمجھا۔“  
 ”مثلاً تم۔“ کل کی ستارہ شناسی میں میں نے تمہیں پڑھا تھا۔“  
 ”اے کیا واقعی؟“ شیشی مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔  
 ”ہاں شیشی۔ اور تمہارے بارے میں جان کر مجھے سخت

حیرت ہوئی۔“  
 ”کیا جان سکتے تم میرے بارے میں؟“  
 ”یعنی کہ تم سمجھو کہ جو بار بار ی کی کہتے ہو۔ ملکی لڑھی فرخت کرتے ہو۔ تمہارے پاس دولت کے انبیاؤں اور آدمی دنیا میں تمہارا سیاہ کارو بار پھیلا ہوا ہے۔“  
 ”کیا بکواس ہے۔ شیشی نے کہا۔“  
 ”مقام ایک دیسی عورت کے بیٹے ہو جسے خود ہی یہ بات معلوم نہیں کر رہا باپ کون ہے۔“  
 ”یہ تم میری مہمان نازی کا صلہ دے رہے ہو شیشی دہاڑا۔“  
 ”پچھلے سال تم نے لاگوس کی ایک مقدر شخصیت کو بھی قتل کر لیا تھا جس کے عوض تمہیں ایک بڑی رقم ملی ہے۔“  
 ”میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“  
 ”اور اب تم ایک اور سیاحتی تل پر دعوے کئے گئے ہو۔“  
 ”تم۔ تم کون ہو؟“  
 ”پرنس شائیس۔ زوجان نے سکرٹے ہوتے کہا۔  
 ”میرے بارے میں یہ سب کچھ کس طرح جانتے ہو؟“  
 ”ستاروں کی مدد سے میں نے نہیں بتایا تھا شیشی۔“  
 ”میں ستارے قلم سے نہیں مانتا، تمہاری شخصیت پہلے ہی میرے لئے پڑا۔“  
 ”اور اب اور زیادہ ہوئی ہے، تم کیا جانتے ہو کیا میں کسی ایسے آدمی کو آزاد چھوڑ سکتا ہوں جو میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔“  
 ”میں نے جو کچھ کہا ہے غلط تو نہیں کہا شیشی۔“  
 ”ہاں غلط نہیں کہا۔ لیکن تمہاری یہ معلومات میرے لئے بے حد خطرناک ہو سکتی ہیں تم جس وقت بھی چاہو میرے لئے کوئی بھی خطرناک قدم اٹھا سکتے ہو۔“  
 ”اے شیشی تمہارا کہنا درست ہے، لیکن خود میرے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“  
 ”کچھ بھی نہیں اور نا ہی میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں، میں صرف یہ معلوم کرنا پسند کروں گا کہ تمہیں یہ ساری معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔“  
 ”عجیب اتفاقاً گفتگو کر رہے ہو شیشی۔ کیا میں تمہیں بتا نہیں چکا؟“  
 ”جو کچھ تم نے بتایا ہے اسے میں نے تسلیم نہیں کیا۔ شیشی نے غراتے ہوئے لہجے میں کہا۔  
 ”ذکر اس سے کیا تمہارا پڑتا ہے۔ پرنس شائیس نے شانے ہلاتے ہوئے کہا۔  
 ”فرق بہت فرق پڑتا ہے پرنس شائیس۔ تم اگر فلپائن کے شہزادے کے بھی ہو تو ظاہر ہے کسی کو یہ بات نہیں معلوم کہ تم اس

وقت میری کوٹھی میں ہو رہی تھی میں نہیں تھی قتل کرنا گا اور میں دفن کر دیا گا اور تمہاری کہانی کسی اس عمارت سے باہر نہیں ہو سکتی تمہیں صرف تلاش ہی کیا جاتا ہے، کیا مجھے ہر شے کی کوڑیوں کے بارے میں اتنا جاننے کے بارے میں اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے؟ "ہل شے کی اس کی بھی وجہ ہے"

"وہ کیا؟"  
"میں ساری دنیا میں خود کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں اور یہ خیال ہے کہ میں حق بجانب ہوں"  
"مارا کھا جاوے دوست"  
"آزاد شہر ہے۔ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
"یہ بات ہے شے کی کی مسکراہٹ خوفناک ہو گئی پھر اس نے زور سے آواز دی"  
"جنگارو"

"تین افراد ایک دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ یہ تینوں سیاہ نام تھے۔ اور ان کے جسموں پر لنگوٹ کسے ہوئے تھے۔ ان کے بدن کی فولادی پھلیاں صاف نظر آ رہی تھیں جن سے ان کی جانی قوت کا نلکہ ہوتا تھا۔

"پرنس کو نہایت عزت کے ساتھ اردو" مجھے ان سے ایک بات اگروانی ہے اور پرنس جس وقت آپ ان تینوں سے آگے آئیں تو اسلان کریں کہ آپ اپنی حقیقت بتانے پر آمادہ ہیں۔ یہ ٹکے جاتیں گے۔"

"مجھے یہ بات پسند نہیں آتی شے کی پرنس نے کہا۔  
"کیا مطلب؟"

"تم خود ہی یہ کوشش کرتے تو ٹھیک تھا"  
"اوہ تم سیکے قابل نہیں ہو پرنس"

"اور تم میرے مقابل نہیں ہو رہے باقی رہی ان لوگوں کی بدلت کر ان کی کیا مجال کہ مجھے اٹھ سکیں؟"

"اب یہ بات بھی نہیں ہے پرنس۔ یہ بڑے وفاتنا س میں اور انہیں جو حکم دیا جاتا ہے اس کی بجا آئی میں یہ نہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں کرتے۔ جنگارو شہر شروع ہو جاؤ پرنس اپنے بارے میں بڑی غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

"ہن۔ گا۔ مد۔ کیا یہ ان تینوں کا نام ہے پرنس شائیں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ تینوں اس کی جانب خود بخود نکالے گئے دیکھنے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور پرنس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

"پیارے دوستو بہتر ہے کہ مجھ سے ملنے کی بجائے تم خود آجی میں ملو، اندھا کوئی کسڑ نہ جلتے، اگر تم میں سے کوئی ایک

دوسرے کے ہاتھوں مارا گیا تو میرا خیال ہے شے کی بلکل ناراض نہیں ہوں گے، چلو شروع ہو جاؤ اور شے کی نے ایک تیز آنکھ نظر کیا۔  
"بھانک وہ تینوں آپس میں گھس گئے تھے، ایک دوسرے کے سخت دشمن بن گئے تھے۔ حالانکہ وہ تینوں گہرے دوست تھے اور شے کی نے انہیں بڑی محنت سے تربیت دی تھی۔ وہ پوری قوت سے ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگے، گھونٹے، لالت، بھڑکے، پھوٹے ہوئے ہونگے تھا جمل سے تھے اور شے کی۔ وہ تینوں لمحات کے لئے تیار ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں نے پرنس کی بات اس طرح کیوں مان لی تھی تب وہ خود بخود انا ملازمین وہاں۔  
"اگر وہ کئے تھے، میں نے تم سے کہا ہے کہ پرنس کو ملو۔"  
"خاموش ہو جاؤ شے کی انہیں لانے دو، ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ تمہاری ہی تکالیف کر ڈالیں۔"

"بکواس مت کرو" اسے تم لوگوں نے سنا نہیں میں تمہیں گولی مار دی گا، شے کی نے کہا اور پتول نکال لیا۔ لیکن یوں لگتا تھا جیسے تینوں سیاہ ناموں پر اس کی دھمکی یا اس کی آواز کو کوئی اثر ہی نہ ہوا ہو۔ وہ ایک دوسرے سے گم گم تھا ہر طرف سے لیکھ لیکھ ہی ان پر گولی نہیں چلا سکا۔ ان میں سے دو زمین پر لیٹ گئے تھے اور میرا شہر میں کے سمانداز میں جمول مل تھا۔ پھر وہ بھی زمین پر گر پڑے تینوں

## گیسوئے اردو ابھی....

مجید ملک صاحب زبان کے معاملے میں کافی سخت گیر تھے ایک دفعہ کسی نے ان کے سامنے گالیاں نکالنا کہا، انہوں نے فوراً ٹوک دیا کہ یہ پنجابی محاورہ ہے، اردو میں گالیاں دینا کھتے ہیں ایک دن میری موجودی میں فیض سے کہنے لگے "بھئی! تم تو عربی داں ہو مگر کل جب تم اپنا ایک شعر سنا ہے تھے تو تم نے بے نیل مرام کو بے نیل و مرام پڑھا۔" فیض نے ذرا جھینپ کر کہا "مجید بھائی! غلطی ہو گئی ہوئی" مجید ملک صاحب نے جرح جاری رکھتے ہوئے کہا "نہیں میں آج تمہاری کتاب زنداں نامہ دیکھ رہا تھا۔ اس میں بھی بے نیل و مرام ہی لکھا ہے، وہاں بھی تم نے درست نہیں کیا،" فیض نے بعد میں یہ غلطی درست کر دی تھی، چنانچہ نسخہ ہائے وفا میں بے نیل و مرام ہی لکھا ہے۔

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قلعہ کوچہ یار سے بے نیل و مرام آتا ہے نیز

ڈاکٹر افتاب احمد

نوں میں لہو لہاں تھے۔  
"کلیا خیال ہے شے کی؟" نوجوان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
"شے کی جو تک چلا پھراس نے پھیکے اٹلے سے کہا۔  
"شاید تم کوئی پینٹاٹ ہو؟"  
"ممكن ہے۔"  
"ممكن نہیں، یہ حقیقت ہے"  
"مچل ٹھیک ہے"

"لیکن اس کے باوجود تمہیں میرے بارے میں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا؟"  
"یہ تو کون سی بڑی بات ہے شے کی، ٹھہرو تمہیں مانتا ہوں۔  
نوجوان نے کہا اور پھراس نے اپنی جیب سے ایک لمبے ریکارڈ نکال لیا، یہ پتول جیب میں رکھ لرا اس کی موجودگی مفاہمت کی نفاذ کا ختم کرتی ہے۔

"شے کی نے پتول جیب میں رکھ لیا تھا، میں اگر جا ہوں شے کی تو تم بازاروں اور سڑکوں پر اپنے کالے کرتوؤں کی داستان سنانے پھر دو تم اپنے کپ کو بہت بڑا عجز سمجھتے ہو۔"  
"لیکن شے کی نے کہنا چاہا۔"

"بڑا عجز میں ہوں شے کی، میری قوت کے سامنے دوسری کوئی قوت نہیں ہو سکتی۔ سنو۔ یہ اعتراف کس نے کیا ہے۔ نوجوان نے کہا اور شے کی ریکارڈ آن کر دیا۔ اور پھر شے کی کے اعترافات سنائی دینے لگے۔  
شے کی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں، پھر جب وہ ساری باتیں سن چکا تو اس نے سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا، یہ تو میری ہی آواز ہے۔ اسنے کہا "ہاں شے کی میں نے کہانا میں خود کو سب سے بڑا عجز سمجھتا ہوں اور بات کسی طور گوارا نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا شخص میرے مقابل رہے یہاں اس شہر سے میں نے مجرموں کا خاتمہ کر دیا ہے اور تمام جرائم پیشہ افراد کو اپنا مطیع کر لیا ہے۔"  
"کیا مطلب شے کی نے تعجب سے پوچھا۔

"دراصل یہ میری ہالی ہے شے کی، میں ملک ملک کی سیر کرتا ہوں اور وہاں پر اپنی بڑی بڑی بنا کر پھوڑ دیتا ہوں، میری ہڈیاں یہی ہوتی ہیں ان لوگوں کے لئے کہ دنیا سے جرائم کا خاتمہ کیا جائے اور مجرموں کو ایسا ماحول مہیا کیا جائے کہ وہ جرائم چھوڑ دیں، وہ جو عادی مجرم ہوتے ہیں انہیں قانون کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی سزا بھگتتے رہیں۔ اور وہ جن میں سدھرنے کی صلاحیت ہوتی ہے انہیں ہم اچھائیوں کی جانب لے آتے ہیں۔ یہ میرا مشن ہے شے کی جہاں تک رہی دولت کمانے کی بات تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں صرف انہیں اس کی اجازت دے سکتا ہوں جو

میرے نوابوں اور سہولت۔

"مگر کیا تم مجھے بھی اپنا مطیع کرنا چاہتے ہو؟"  
"ہاں شے کی یہی مقصد ہے میرا میں یہی چاہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو اپنا سمجھنا چھوڑ دو اور میری سرکشی میں آ جاؤ۔"  
"لیکن شے کی نے ایسا کبھی نہیں کیا۔"  
"مگر ناہم شے کی، مجبوری ہے۔ پرنس نے کہا اور شے کی خود بخود نگاہوں سے اسے گھورتا رہا۔ پھراس نے گہری سانس لے کر کہا۔  
"مگر اس تمہاری پناہ میں آنے سے انکار کر دیا تو؟"  
"تو اس دنیا میں تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ تم کرتوں کی طرح سڑکوں پر پھوڑتے پھر گے شے کی۔ ایسا کرو آج اس موضوع پر بات نہیں کرتے۔ آج رات تم مجھے اپنے وہ خفیہ کاغذات پیش کر دے گے جن میں تمہارے کالے کرتوؤں کا تعویذی ثبوت موجود ہے اور اس کے بعد۔"

"میں کون شے کی کر دیا گا؟"  
"یہ تو آنے والا وقت بتانے کا۔"  
"اور۔ اب کوئی وقت نہیں آئے گا۔ شے کی نے کہا اور پتول دوبارہ نکال لیا۔

"اس پتول میں رنگین پانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے شے کی۔" میں اپنی حفاظت کا بندوبست ہمیشہ رکھتا ہوں۔ نوجوان مسکراتا ہوا۔ اور شے کی نے فائر کر دیا لیکن اس فائر کے نتیجے میں بھی اسے ہلکا دیا تھا۔ پتول سے گولی کے بھانے پانی کی رنگین دھواں نکلی تھی۔  
شے کی ہلکا کر پتول دیکھنے لگا "یہ بس ختم شے کی۔ کل گفتگو کریں گے۔ نوجوان ہاتھ اٹھا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔  
"سنو۔ سنو تو شے کی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔  
"ہاں کہو۔"

"میں تم سے تعاون کرنا چاہتا ہوں۔ بولو مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"  
"یہ بھی کل ہی بتاؤں گا شے کی۔"  
"لیکن کل تک.... میں پریشان رہوں گا۔ شے کی اب بالکل پست ہو گیا تھا۔

"مجبوری ہے شے کی، کل تک تم مزید کوشش کرنا کہ مجھے اپنے راستے سے ہٹا سکو۔ لیکن کل کے بعد تم یہ خیال ہمیشہ کے لئے ذہن سے نکال لینا۔"  
"اوہ۔ تم پر سر قوتوں کے مالک ہو۔ میں جان چکا ہوں۔  
میں تم سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"لاکل تک کیلئے خدا حافظ شے کی۔ نوجوان اس کے کمرے سے نکل آیا اور شے کی بے چارگی سے اسے جانتے دیکھتا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر وہ تینوں کی جانب متوجہ ہو گیا اور ہوش پڑنے لگے۔  
دوسرے دن شے کی نے نوجوان پرنس شے کی کو روکے تم پر

میں تلاش کر لیا۔ اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا۔ نوجوان شائیس نے کہا تھا کہ اس رات شیگی اپنے خفیہ کاغذات اس کے حوالے کر دے گا۔ یہ کاغذات حقیقت شیگی کے لئے زندگی موت کا درجہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی خوف کے تحت وہ پوری رات نہیں سو سکا تھا۔ اور صبح اس نے خفیہ ججوری سے اپنے کاغذات نکالنے چاہے تو وہ غائب تھے۔ پرنس کی ہر ممکن تلاش کے بعد یوں ہو کر وہ اپنی عمارت میں واپس آ گیا تھا۔ اور اب اس کے اوصاف عموماً دے گئے تھے۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھا گیا تھا کہ کھڑا نہ کے پوری رات اسے یاد تھی۔ لیکن رات کو زمین بچے سے چار بجے تک کا وقت اس کے ذہن سے غور تھا۔ سخت کوشش کے باوجود اسے یاد نہیں آ سکا کہ اس وقت اس نے کیا کیا تھا۔

لیکن کاغذات غائب تھے۔ شام کی چائے پر اچانک شائیس مسکراتا ہوا بچ گیا۔

شیگی اسے دیکھ کر کھیل پڑھا۔ تم... تم کہاں چلے گئے تھے؟ اس نے غرور سے لہجے میں سوال کیا۔

”اوہ ڈیر شیگی! کچھ ضروری کام تھے۔ ان کی انجام دہی کے لئے۔ چائے پلاؤ سخت متکون محسوس ہو رہی ہے، وہ اطمینان سے بیٹھا ہوا ابلا شیگی کا بس نہیں چلتا تھا۔ وہ نہ اس کی لڑکیاں اپنے دانوں سے نرج با لیا۔ وہ کتنا پریشان ہوا تھا اور عیناً ہوا تھا اتنا وہ ساری زندگی میں بھی نہیں ہوا تھا، نہ جانے یہ کب بخت کیا بلا ہے۔ یہ سارا ہوا ان کی بھ سے باہر قتلہ تاہم اس نے اپنے غصے پر قابو لیا۔ اور نہایت سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”وہ۔ وہ کاغذات میری ججوری سے غائب ہیں؟“

”تم نے خود ہی مجھے لاکر دیے تھے شیگی، نوجوان نے سکون سے کہا۔ شیگی کی کشتی کی پشت سے ٹک گیا کالی رنگ اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ پھر اس نے بھارتی ہوئی آواز میں کہا

”کوئی جواب۔ اب وہ کہاں ہیں؟“

”میں نے انہیں بڑی محفوظ جگہ رکھ دیا ہے، البتہ ان کی نقل موجود ہیں۔ میں نے ان سب کی فوٹو اسٹیٹنگ نکلوا لی ہیں اور میں تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ممکن ہے کبھی انہیں ان میں سے کچھ دیکھنے کی ضرورت پیش آئے تو تم دیکھ سکو، چنانچہ اپنی امانت تم سہا لے۔ لو۔“ نوجوان نے کاغذات کا ایک پلندہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

انڈی شیگی جلدی سے اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ اس کے وہ کاغذات تھے جو اس کی موت کا ہوا بھی ہو سکتے تھے۔

”مگر۔ مگر تم ان کا کیا کرو گے؟ شیگی نے پریشان لہجے میں

پوچھا۔ ”میں کچھ نہیں کروں گا شیگی۔“ میں نے تم سے کہا تھا تا کہ میں کلام سے بمت کر دوں گا، اصل میں تم سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہوں، نوجوان نے کہا۔ شیگی اس کی صورت دیکھتا رہا۔ چلتا کھتی تھی، شیگی نے خود ہی اس کے لئے چائے بنا لی اور اسے پیش کر دی۔ چند ساعت خاموش رہنے کے بعد شیگی نے اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔

”کیسا معاہدہ؟“

”میرا اصل شہر شیگی میں ہے، اپنی اپنی بنا چکا ہوں، میں مختلف ملک میں اپنی ایسی رانچیں قائم کرتا ہوں جہاں جرائم کی کوئی بھی کی جاتی ہے اور انہیں اوقات ہرگز نہیں دیکھتا ہوں، ایک عجیب و غریب صورت حال ہے، یہاں اس ملک میں اس شہر میں، ان اطراف میں، میں نے سنا ہے کہ تمہاری آواز کافی بلند ہے، سرکاری حکام سے تمہاری دوستی ہے اور تمہارے معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرے گا چنانچہ شیگی میرے ادارے کو تمہارے تحفظ کی ضرورت ہے تم اس کی پشت پناہی کرو گے اور وقت ضرورت اس کی امداد بھی۔ یہ لہذا کسی طور ملتی نہیں ہوگی، کیونکہ مالی حیثیت سے میرا ادارہ خاما صاف مغرب ہے۔ لیکن اگر کبھی کسی سرکاری اہلکار کے پاس کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہوگی۔ اور تمہارے یہ کاغذات ضمانت کے طور پر ہمارے پاس رہیں گے۔“

”اوہ۔ شیگی کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ لیکن تمہارے ادارے کی کارکردگی کیا ہے شیگی نے پوچھا اور نوجوان اسے تفصیل سے بتانے لگا۔ شیگی نے حیرانہ انداز میں یہ سب کچھ سن لیا تھا۔ تب اس نے پریشان لہجے میں کہا۔

”تو کوئی ایسا کوئی ادارہ یہاں کام کر رہا ہے؟“

”ہاں شیگی اور بہت کچھ کر رہا ہے۔“

”تعجب ہے۔ میں اس سے اب تک لاعلم ہوں۔ یہ تو بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوگا۔“

”ہاں شیگی۔ نہایت اعلیٰ پیمانے پر۔“ میرے جانے کے بعد فضل خان اس کا درجہ سنا ہے تم اس سے معاشرت کرو گے۔“

”مگر صرف اتنی سی بات ہے تو پھر آؤ دوستی کا معاہدہ کریں کاغذات مجھے واپس کر دو۔ میں صدمہ کرتا ہوں کہ“

”اور میں وعدہ کرتا ہوں شیگی کہ ان کاغذات سے کبھی کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا جائے گا۔“

”لیکن اگر.....“

”ہمیں اعتماد کی ضمانت میں کام کرنا ہوگا؟“

”تمہاری فری۔ دلچسپ تھا اور اس سے میں بھی دلچسپی رکھتا ہوں۔ تم اس کی طرف سے بے فکر رہو۔“

B  
Y  
S  
A  
L  
I  
M  
K  
H  
A  
N

ہر شکر شیگی۔ اب میں بھی تمہیں اعتماد دے گا۔“

”کیا مطلب؟“

”میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں زمین درو عدالت لے جاؤں اور اپنے ساتھیوں سے ملاؤں۔ تاکہ وہ تمہارے تمام گنہگاروں کو سزا دیں۔“

”میں تیار ہوں۔ شیگی نے گریں ہاتھ جوئے کہا۔“

.....

فضل خان ارشدی کی ایک دوسرے سے واقف تھے۔ فضل خان نے سزا تے ہوئے اس کا استقبال کیا تھا۔

”انتا بڑا آدمی اس جگہ؟“

”بڑے بڑے آدمی ہوں فضل خان۔ اور خوش نصیب بھی کہ ایک ایسے آدمی کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔“

”کیسا کاروبار چل رہا ہے شیگی بولا؟“

”بہت عمدہ۔ کئی بار ہمیں تلاش کیا۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ فضل خان اتنی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔ اولاً۔۔۔ اب تو شیگی کے پاس ہاں بن گئے ہو۔“

”میں۔“ فضل خان تعجب سے بولا۔

”ہاں۔ اب میں تمہارا حکم ہوں۔“

”وہ کس طرح؟“

”نہیں فضل خان؟ یہ صرف ہر شیگی کا احساس ہے۔ یہ نہ صرف ہمارے معاملے بلکہ محافظ ہوں گے اور ہماری سرکاری اہلکاروں کو حل کر دیں گے۔ اب یہ اسے کچھ بھی سمجھ لیں۔“

”بہر حال شائیس۔ مجھے تمہارا یہ پروگرام بہت پسند آیا ہے اور اس کے فروغ کے لئے میں دس لاکھ روپے مالی امداد کے طور پر پیش کرتا ہوں۔“

”چلن شائیس تمہارا بے ہوش کر رہا ہے۔“

فضل خان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور نوجوان مسکرا رہا تھا۔ اور شے خان مان لے میرے بار۔ مان لے۔“

”مجھے شرمندہ مت کرو فضل خان! تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ ہرنے۔۔۔ جہ کے لئے کتنا بہترین کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کام تو دنیا بھر کی حکومتوں کو کرنا چاہئے جو ہم چند لوگ اپنے طور پر کر رہے ہیں۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن میں تو تیرے جانے کی بات کر رہا ہوں۔“

”یہاں اتنے بے حد ضروری ہے فضل خان تم خود سوچو جو کچھ میں نے کیا ہے، اگر تم اس سے متفق ہو تو کیا میں یہیں پر چھوڑ دوں؟ بڑے شمار مالک ایسے میں فضل خان جہاں کے قانون پوری طرح اپنے شہروں کو مطمئن نہیں کر پاتے۔ میں جو کچھ کرتا ہوں انسانیت کے راستے پر چلتا ہوں اور تمہارا ہوں۔ محمد خان جیسے بہت سے لوگ کہہ رہے ہیں کہ وہ ہے اور میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میں یہاں آتا ہوں گا۔ کسی تری ملک

میں لہجہ اس کھیل کی داغ بیل ڈالنے کے بعد وہاں اپنی زمین میں عدالت منبر پر کھڑے ہونے کے بعد میں پھر واپس آؤں گا اور اس کے بعد ممکن ہے میں ایک طویل عرصہ تک تمہارے ساتھ قیام کروں۔ مجھ سے محبت کے اظہار کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ یہ عدالتیں بہتر طور سے کام کرتی رہیں۔“

فضل خان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور شے خان نے لگے لگے ہر کراہے سینے سے لپٹا لیا۔

”فضل خان میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے دوسرے اتنی محبت مت کر میں تو صفر چوں جس کا ہرنا۔ ہرنا کیسا ہے میری زندگی اور موت سے اس زمین پر کی کیا اثر نہیں پڑے گا۔ چنانچہ میں اپنی ذات کے وہ نقوش چھوڑ جانا چاہتا ہوں کہ کم از کم لوگ صفر کر رہی اہمیت دینے لگیں، بہر صورت مجھے یقین ہے کہ کرمی مدد کرے گا اور مجھ جاننے سے نہیں روکے گا۔“

فضل خان نے آنسو پونچھے اور گریں ہادی شے خان مسکرانے لگا تھا کہ تم آفیسر نے اس نوجوان کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے کھڑا ہوا تھا اور جس نے وہ سورت کس اٹھا یا جو کافی ذہنی تھا۔ جس کا ذہن دیکھ کر ہی اسے کچھ شبہ ہوا تھا۔

”کیسا ہے اس سورت کس میں؟ اس نے سوال کیا۔“

”ٹھیک اور کٹھی۔ نوجوان نے جواب دیا اور کرمی آفیسر کی نگاہوں سے اسے گھورنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ نوجوان خالی کر رہا ہے تب اس نے جھلکے ہوئے انداز میں سورت کس کو کھولا اور یہ دیکھ کر حیرت سے اس کی آنکھیں کھل گئیں کہ سورت کس میں ایک شین گن، کچھ گرنٹ اور کئی ٹولوں کی گڈیاں موجود تھیں کہ کرمی آفیسر نے حیرت سے کھلا۔ اس نے حیرانہ انداز میں اسے نوجوان کو دیکھا تب نوجوان مسکراتا ہوا بولا۔

”اے بندہ کو آفیسر مجھے یقین ہے کہ تم اس پر کلمہ نس چٹ لگا دو گے۔ ظاہر ہے اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا۔“

”کرمی آفیسر نے چند ساعت اس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے سورت کس بند کر دیا۔“

”ہاں اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ نرم لہجے میں بولا اور پھر اس نے سورت کس بند کر کے اس پر کلمہ نس چٹ لگا دی۔“

”شکر ہے آفیسر نوجوان نے اپنا سورت کس اٹھا یا اور اسے چٹ کی عمارت کی جانب چل پڑا۔ کرمی آفیسر کے بعد وہ ایک کبھی نہیں کر رہا تھا کسی نئے ملک میں کسی نئے ہنگامے کا آغاز کرنے کیلئے۔“

